اگست ۱۹۸۸ء

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

مدیرِ مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اول	حافظ عاکف سعید	۲
ہدایت القرآن (۲۵)	مولانا محمد تقی امینی	۵
آیۃ الکرسی (نثری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۱۱
اسلام کا نظامِ روحانی	مولانا ڈاکٹر غلام محمد	۱۷
برصغیر پاک و ہند کی شرعی حیثیت	ڈاکٹر محمود احسن عارف	۳۱
حکمتِ اقبال (۱۳)	ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم	۴۳
تصحیح و تنقیح	مولانا قاری عبدالباسط	۶۱
تبصرۂ کتب	ادارہ	۶۳

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

خطباتِ جمعہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

نے مسجد دارالسلام لاہور میں مسلسل آٹھ خطباتِ جمعہ میں

حقیقتِ ایمان

کے موضوع پر جو نہایت جامع اور مؤثر تقاریر فرمائی ہیں

اُن تقاریر کی کیسٹوں کا سیٹ تیار کر لیا گیا ہے

ہدیہ مکمل سیٹ -/۱۶۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

عنوانات

۱۔ ایمان کے لفظی معنی اور اصطلاحی مفہوم
۲۔ ایمان کا موضوع۔ مابعد الطبیعاتی مسائل
۳۔ ایمانیاتِ ثلاثہ، اور ان کا باہمی ربط
۴۔ ایمان کی دو قسمیں: قانونی اور حقیقی
۵۔ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق
۶۔ ایمانِ حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ کا باہمی لزوم
۷۔ ایمان کا اصل حاصل: ذہنی اطمینان اور قلبی سکون
۸۔ ایمان کی تحصیل کے دو طریق: تقلیدی اور اکتسابی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور فون: ۸۵۲۶۸۳

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ۔ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۷

اگست ۱۹۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ

شمارہ ۸

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴۔ فون ۸۵۲۰۰۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، متصل آرام باغ، شاہراہ لیاقت، کراچی۔ فون ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون۔ ۴۰ روپے فی شمارہ۔ ۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ہمیں شدت سے احساس ہے کہ قارئین بڑی بے تابی سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس جواب مضمون کے منتظر ہوں گے جس کا وعدہ گذشتہ دو شماروں سے کیا جا رہا ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کو وہ مطلوبہ فرصت میسر نہ آسکی جو اُن کے قلم کو حرکت میں لانے کا باعث بنتی۔ قارئین اس امر سے بخوبی واقف ہیں، اور خود محترم ڈاکٹر صاحب نے متعدد بار اپنے زبان و قلم سے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے عقدۂ لسانی کو اپنے فضل و کرم سے جس درجے کھولا ہے اور اس قوت بیان کو انہوں نے اُسی کی تائید و توفیق سے قرآن حکیم کی تعلیمات کو عام کرنے بلکہ قرآن کی طرف پکارنے میں استعمال کیا ہے، قلم کی گرہ نہ صرف یہ کہ اُس درجے کھلی ہوئی نہیں ہے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اُن کے قلم پر گرہ خاصی مضبوطی سے لگی ہوئی ہے چنانچہ اس گرہ کو کھولنے کے لیے انہیں بہت کچھ ذہنی تیاری تو درکار ہوتی ہی ہے بسا اوقات اپنی طبیعت پر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک بار قلم چل پڑے تو الحمد للہ کہ ع "رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کے مصداق خیالات و افکار کا دریا بڑی روانی سے بہتا ہے، اور بالعموم مضمون کی تکمیل تک کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ ویسے اس بار ذہنی تیاری کا ہفت خواں بہت حد تک طے ہو گیا تھا کہ ہمارے بزرگ رفیق کار محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے صاحبزادے کے اچانک انتقال کے باعث محترم ڈاکٹر صاحب کو کراچی جانا پڑا۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ مرحوم کے لیے تہہ دل سے دعائے مغفرت کریں اور محترم ڈاکٹر صاحب کے لیے بھی دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے ارادے کو پورا فرمائے کہ وہ بعض اہم مضامین کو ضبط تحریر میں لا سکیں۔

اس دوران مسئلہ زیر بحث سے متعلق بعض مزید خطوط موصول ہوتے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے پیش نظر مسقط سے ایک خط بطور نمونہ پیش خدمت ہے

محترم و مکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ "حکمتِ قرآن" بابت جولائی موصول ہوا اور "حکمتِ قرآن" ماہِ جون کے بارے میں لوگوں کی آراء نظر سے گزریں۔ میرے دل میں بھی خیال پیدا ہوا کہ اپنے خیالات کا اظہار کروں۔

میرے نقطۂ نگاہ میں مذکورہ حکمتِ قرآن بلاشک وشبہ حکمت کے موتیوں سے بھرپور تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس امر کی توفیق دے کہ ہم اس بلند روحانی مقامات کو سمجھ سکیں۔ آمین! ثم آمین۔ میں ذاتی طور پر آپ کے خیالات سے کامل اتفاق کرتا ہوں۔ اپنے ایک بزرگ دوست کو مذکورہ مضمون کی فوٹو کاپی ارسال کر رہا ہوں۔ آپ کا آئندہ کا مضمون پڑھنے سے تعلق رکھتا ہوگا۔ امید ہے کہ آپ انشاءاللہ وقت نکال کر اس موضوع پر قلم اٹھائیں گے۔

معلوم و محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آپ کے سینے کو قرآن کی حکمتوں کے لئے کھول دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں مزید عنایات عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!

رفقائے تنظیم اسلامی کو بہت بہت دعائیں اور سلام۔

اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

مخلص

گلزار احمد

وزارتِ دفاع (شعبہ مالیات)

ص۔ب ۔ ۱۱۳ مسقط

گذشتہ ماہ انہی صفحات میں سعودی عرب سے ہمارے ایک رفیق محترم مولانا قاری عبدالباسط صاحب کا خط شائع کیا گیا تھا۔ خط کی اشاعت کے ساتھ محترم قاری صاحب کے بارے میں جو تعارفی کلمات تحریر کیے گئے تھے ان میں سے ایک جملہ محترم قاری صاحب کو خلافِ واقعہ معلوم ہوا چنانچہ اس ضمن میں انہوں نے ہمیں ایک وضاحتی مراسلہ ارسال کیا ہے جو من وعن پیشِ خدمت ہے۔

محترم و مکرم جناب حافظ عاکف سعید صاحب

سلام اللہ علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ و بعد

جولائی ۱۹۸۸ء کا "حکمتِ قرآن" آج ہی بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ آپ نے حرفِ اوّل میں، میرا خط ہی اوّلاً شائع کیا ہے۔ آپ نے میرے بارے میں لکھا ہے کہ "مسلکِ اہلِ حدیث سے ذہنی و قلبی مناسبت ہے۔" حالانکہ میں نے اپنی کسی بھی تحریر میں کبھی بھی مسلکِ اہلِ حدیث اور اہلِ حدیث حضرات کے بارے میں اشارۃً بھی کچھ نہیں لکھا، نجانے آپ نے کیسے مجھے اس مسلک سے وابستہ کر دیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلکِ اہلِ حدیث (میری رائے کے مطابق) باقی تمام مسالک و سلاسل وغیرہ کی نسبت، سنّت اور حق کے زیادہ قریب ہے، مگر جس تقلید کی وجہ سے اہلِ حدیث اپنے آپ کو مقلّد حضرات سے ممیّز کرتے ہیں، وہی تقلید تو ان حضرات کے ہاں بھی موجود ہے۔

ناچیز کا تعلق کسی خاص مکتبۂ فکر اور مسلک سے نہیں ہے، قرآن میں ہم سب کو "ھو سماکم المسلمین" کہہ کر مسلم کہا گیا ہے، لہٰذا ہمیں اپنے آپ کو صرف اور صرف مسلم ہی کہنا چاہیئے، مجھے امید ہے کہ آپ میری اس وضاحت کو حکمتِ قرآن اور میثاق میں شائع فرما دیں گے۔ تاکہ اندرونِ پاکستان اور بیرونِ پاکستان موجود میرے متعلقین و احباب کو غلط فہمی نہ ہو۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیازمند

عبد الباسط (سعودی عرب)

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مولانا محمد تقی امینی

(۲۵)

شیطانی علم اور سفلی عمل کے پیچھے لگنا گری ہوئی قوموں کا شیوہ ہے

اللہ کی ہدایت جو اللہ سے سچا تعلق پیدا کر کے زندگی کو سرگرم بناتی اور ترقی کی راہ پر لگاتی ہے گری ہوئی قوم کے لوگ اس کو پس پشت ڈال کر شیطانی علم اور سفلی عمل (جادو ٹونا ٹوٹکا وغیرہ) کے پیچھے لگ جاتے ہیں جس سے ان کی زندگی سرد پڑ جاتی ہے اور کسی جدوجہد کے بغیر کامیابی کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح گری ہوئی قوم کے لوگ ہدایت کا سیدھا راستہ چھوڑ کر ایسے گنڈے تعویذ اور عملیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں کہ جن سے ان کے کفر تک بات پہنچتی ہے اور لوگوں کو فائدہ کی بجائے نقصان پہونچاتے ہیں اس طرح اپنی آخرت برباد کرتے ہیں۔ آیتوں میں ان دونوں قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ
فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ
وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُو الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ
وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنزِلَ عَلَى
الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ
يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا
بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا

لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا
لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

"اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسولؐ آیا جو اس کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کی ایک جماعت نے اللہ کی کتاب (تورات) کو اپنی پیٹھ کے پیچھے ایسا پھینک دیا کہ گویا اسے جانتے ہی نہیں ہیں[1]۔ اور انہوں نے اس چیز کی پیروی کی جس کو شیطان سلیمانؑ کی حکومت کے زمانہ میں پڑھتے تھے اور سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا تھا۔ لیکن شیطانوں ہی نے کفر کیا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے[2]۔ اور انہوں نے اس کی بھی پیروی کی جو شہر بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اتارا گیا تھا[3] اور وہ کسی کو نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو صرف آزمائش کے لئے ہیں۔ تم کفر میں نہ پڑ جانا[4]۔ وہ لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے تھے جن سے میاں بیوی میں جدائی ڈالیں۔ حالانکہ وہ اس سے کسی کو اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نقصان نہ پہونچا سکتے[5]۔ اور ان سے وہ سیکھتے تھے جو ان کو نقصان دیتی نفع نہ پہونچاتی تھی حالانکہ ان کو معلوم تھا کہ جس نے اس چیز کو خریدا (اختیار کیا) اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں ہے اور کیا ہی بری چیز ہے کہ جس کے بدلے انہوں نے اپنے کو بیچ دیا۔ کاش وہ اس کو سمجھتے اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو یقیناً اللہ کے یہاں اس کا بہتر اجر تھا۔ کاش کہ وہ جانتے۔

●

[1] اللہ کی کتاب توریت موجود تھی جس میں آنے والے رسولؐ کا ذکر تھا اور وہ رسولؐ جو آگیا) بھی توریت کی تصدیق کرتا تھا اس کے باوجود یہودی اللہ کے رسولؐ پر ایمان نہ لائے

اور تورات میں رسولؐ کے ذکر کو پس پشت ڈال دیا پھر جیسا کہ دستور ہے کہ گری ہوئی قومیں گراوٹ کے زمانہ میں گری ہوئی باتوں کو اپنا مشغلہ بنالیتی ہیں ویسا ہی یہودیوں نے بھی کیا کہ اللہ کی ہدایت کے مقابلہ میں جادو ٹونا ٹوٹکا اور سفلی عملیات کے پیچھے لگ گئے اور انہیں میں اپنی زندگی کی بہترین قوت صرف کرنے لگے۔

۲ے حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں جادو اور سفلی عملیات کا بڑا زور تھا۔ یہودی ان سب کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر کے جائز سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی اتنی بڑی سلطنت اتنی شوکت کے ساتھ انہیں کی بدولت قائم رہی اس بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودی انہیں میں اپنی ترقی و کامیابی کے خواب دیکھتے اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔

قرآن نے اس آیت میں کئی باتوں کو رد کیا ہے:

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کا دامن سفلی عملیات اور جادو وغیرہ سے پاک ہے۔ یہ کفر کے کام ہیں جن کو کبھی اللہ کا رسول نہیں کرتا ہے۔

(۲) یہ شیطانی علم اور سفلی عمل ہے۔ اس کو شیطان ہی کے پیروکار (شریر انسان اور شریر جنات) سیکھتے اور کرتے ہیں۔

(۳) یہ علم و عمل اللہ کی ہدایت کے مقابلہ میں ہے۔ جب کوئی قوم ہدایت چھوڑتی ہے تو اس کو اپناتی ہے۔

۳ے ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے یا فرشتہ صفت انسان تھے۔ بہت غور و فکر اور تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس قول کو ترجیح دیتا ہوں کہ وہ فرشتہ صفت انسان تھے جن کو جادو و سفلی عملیات کے "توڑ" کے لئے گنڈا تعویذ اور عملیات کا علم دیا گیا تھا۔ یہ علم اپنی اصل کے لحاظ سے قابلِ اعتراض نہ تھا بلکہ اس کے ذریعہ جادو و سفلی عملیات کا "توڑ" ہوتا اور لوگوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ لیکن اس کے استعمال کی کچھ شکلیں ایسی بھی تھیں جو کفر تک پہونچاتی اور لوگوں کو فائدہ کے بجائے نقصان پہونچاتی تھیں۔ اس بناء پر تاکید ضروری تھی کہ ان کو اس طرح کرنا کہ جس سے کفر میں پڑ جاؤ یا لوگوں کو نقصان پہونچاؤ۔

ہاروت وماروت سے متعلق بہت سے بے سروپا قصے تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہیں جن کی کوئی سند نہیں ہے اور محققین مفسرین انکو رد کرچکے ہیں۔ عام مفسرین کا خیال یہی ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے لیکن بعض مفسرین ان کو انسان اور فرشتہ صفت انسان مانتے ہیں۔ فرشتہ صفت انسان پر فرشتہ کا لفظ بولا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں کثرت بولا جاتا ہے۔ قرآن میں حضرت یوسفؑ کو دیکھنے والی عورتوں کا یہ قول موجود ہے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ (یوسف آیت ۳۱) — یہ انسان نہیں ہے یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔

بابل (عراق ۳۰۰۰ ق م) میں جادو و سفلی عملیات کا زور شام و فلسطین (حضرت سلیمان کے زمانہ ۹۹۰ تا ۹۳۰ ق م) سے کہیں زیادہ تھا تاریخ کی متفقہ شہادت ہے کہ بابل والوں کے دین و مذہب کا ایک بڑا حصّہ جادوگری و سفلی عملیات سے متعلق تھا۔

قدرت کا قانون ہے کہ جب کوئی چیز حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس سے لوگوں کو نقصان پہونچنے لگتا ہے تو اس کے "توڑ" کا انتظام ضروری ہوجاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں اللہ نے اپنے نیک بندوں "ہاروت وماروت" کے دل میں جادو و سفلی عملیات کے "توڑ" کی بات ڈالی اور انہوں نے تعویذ گنڈے اور روحانی عملیات کے ذریعے اس کا توڑ کیا۔

اس صورت میں دشواری لفظ "اُنْزِلَ" سے ہوتی ہے کہ اللہ کی طرف سے کوئی بات عام انسانوں پر نہیں اتاری جاتی ہے بلکہ نبیوں اور فرشتوں پر اتاری جاتی ہے۔ لیکن "اُنْزِلَ" کے معنی صرف اتارے جانے کے نہیں ہیں بلکہ سکھانے (تعلیم) اور دل میں بات ڈالنے (الھام) کے بھی ہیں (معالم التنزیل و روح المعانی) جس کا مطلب یہ ہے کہ یہودی جس طرح جادو کے پیچھے لگ گئے اسی طرح ان عملیات کے پیچھے بھی لگ گئے جن کا "ہاروت وماروت" کو الہام کیا گیا تھا اور جن کے استعمال کرنے میں احتیاط کی تاکید کی گئی تھی۔

(ان بعض مفسرین جنہوں نے ہاروت وماروت کو فرشتہ صفت انسان مانا ہے)

کے قول کی تائید اُس قرأت سے بھی ہوتی ہے جسمیں مَلَکَین کو لام کے زیر کے ساتھ مَلِکَین پڑھا گیا ہے جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بادشاہ بھی انسان تھے فرشتے نہ تھے، یہ قرأت صحابہ وتابعین کے زمانہ سے ہے اور اس کے راوی ابن عباس ضحّاک حسن بصری ہیں (تفسیر کبیر)

تائید صرف اس قدر ہے کہ فرشتہ کے بجائے انسان مراد لینے کی ایک قرأت بھی موجود ہے اگرچہ تفسیر اس کے مطابق نہیں کی جاتی ہے۔ عام طور سے مفسّرین مشہور قرأت کے مطابق ہی تفسیر کرتے ہیں خواہ فرشتہ مراد لیں یا فرشتہ صفت انسان مراد لیں۔ جن حدیثوں میں مَلَکَیْن لام کے زبر کے ساتھ آیا ہے اس میں بھی یہ بعض مفسّرین فرشتہ صفت انسان ہی مراد لیتے ہیں۔ (بیضاوی)۔

ہاروت وماروت کو فرشتہ تسلیم کرنے میں اعتراض کے جو جوابات دیئے جاتے ہیں راقم الحروف ان سے خود کو مطمئن نہ کر سکا۔ اس بنا پر بعض مفسّرین کے قول کو ترجیح دی۔

لمہ فتنہ (آزمائش) قرآن میں اس کو کہا گیا ہے جس میں اصلاً کوئی خرابی نہ ہو لیکن استعمال اور لوگوں کے طرزِ عمل سے اس میں خرابی آ جاتی ہو۔ اسی لئے سے مال و دولت اور آل واولاد کو "فتنہ" کہا گیا ہے۔

فرشتہ صفت انسان جس کی تعلیم دیتے اس کی بھی یہی حیثیت تھی کہ اس سے فائدہ اور نقصان دونوں کا کام لیا جا سکتا تھا لیکن یہودیوں کے مذہبی پیشواؤں نے ایک طرف تو سب کو چھوڑ کر گنڈا تعویذ اور عملیات کو اپنا مشغلہ اور پیشہ بنا لیا تھا اور دوسری طرف اس کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی کراتے اور وہ کام کرتے جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ صورت حال یہودیوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مسلمانوں اور ہر پست قوم کے مذہبی پیشواؤں میں جن کو اللہ کی ہدایت کی پرواہ نہیں ہے گنڈا تعویذ اور عملیات کی بہت سی ایسی شکلیں اختیار کرتے جن میں کفر تک بات پہنچتی اور لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے۔

کسی قوم میں ان چیزوں کا زیادہ رواج اسی وقت ہوتا ہے جب وہ قوم پست ہو جاتی ہے۔ جدوجہد سے جی چراتی اور زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ کر خواب وخیال کی دنیا میں مگن

رہتی ہے۔

۵ نفع دینے اور نقصان پہنچانے کی ساری تدبیریں ایک طرف اور اللہ کا حکم و فیصلہ ایک طرف۔ اصل بالادستی اللہ کے حکم و فیصلہ کو ہے کہ کسی زمینی تدبیر یا آسمانی تدبیر، شیطانی تدبیر یا روحانی تدبیر کو نہیں ہے۔

نوٹ: جادو و سفلی عملیات اور ان کے "توڑ" کے لئے جو روحانی عملیات کئے جاتے ہیں ان کی اصلیت پر تو گفتگو مشکل ہے۔ یہ دونوں میرے میدان سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ البتہ ان دونوں کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے واقعات و تجربات ہیں کہ جن کی بنا پر ان کو ماننے بغیر چارہ نہیں ہے۔ (جاری ہے)

بقیہ: تبصرہ کتب

ہے کہ شرم سر پیٹ کر رہ گئی ـــــ شہید گنج ہماری تاریخ کا خونچکاں باب ہے جسے انگریز پرست مسلم لیڈروں نے اپنی غدارانہ سرشت سے سپردِ قلم کر کے اس کا ملبہ حریت پسندوں پر گرایا اور یوں وقتی کامیابی تو حاصل کر لی لیکن دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کے قیام کے ۴۱ سال بعد بھی مسجد گوردوارہ ہے تو کیوں؟ یہ کتاب مسجد شہید گنج کے پس منظر میں بہت سی مکروہ کہانیوں کے بے نقاب کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گی۔ ہمیں یقین ہے کہ تاریخ کے طالب علم اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

دین کے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع

حقیقت و اقسامِ شرک پر ڈاکٹر اسرار احمد

کے ایک ایک گھنٹے کے چھ لیکچر جو ۶۰-ج کے چھ کیسٹوں میں دستیاب ہیں

ہدیہ پاکستانی کیسٹ -/۱۰۰ روپے (جاپانی کیسٹ) -/۱۹۰ روپے مع محصول ڈاک

تین سو سے زائد عنوانات پر مشتمل فہرست طبع شدہ موجود ہے۔ خط لکھ کر طلب فرمائیں

نشر القرآن کیسٹ سیریز

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

آیت الکرسی

قرآنِ حکیم کی عظیم ترین آیت اور توحیدِ صفاتی کا جامع ترین مرقّع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ
سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ
مَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ
اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ
الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ:- اللہ (ہی معبودِ برحق ہے) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے۔ سب کا قائم رکھنے والا۔ نہ اس کو اُونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو وہ چاہے، اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند و عظیم ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿

متعدد روایات[1] کے مطابق نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے آیتہ الکرسی کو قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت قرار دیا ہے اور سورۃ اخلاص کو عظیم ترین سورت اور عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ آیت الکرسی قرآن مجید کی طویل ترین آیات میں سے ہے اور سُورہ اخلاص مختصر ترین سورتوں میں سے!

ان دونوں کی عظمت کی یہ مشترک اساس تواظہر من الشمس ہے کہ دونوں میں توحید باری تعالیٰ کا بیان نہایت پرشکوہ انداز میں ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ توحید ہی دینِ حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ یہ حقیقت ذرا غور کرنے ہی سے معلوم ہوتی ہے کہ ان دو مقامات پر عقیدۂ توحید کے دو مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہوئی ہے اور ان دونوں کو اپنی اپنی جگہ توحید کے اس خاص پہلو کے جامع و مانع بیان کے ضمن میں پُورے قرآن میں منفرد مقام حاصل ہے۔

چنانچہ جہاں سورۃ اخلاص حضرتِ حق سبحانہ، کی شانِ احدیت و صمدیت کے پرشکوہ اثبات اور کسی کے کسی بھی اعتبار سے اس کے ہم پلّہ، ہم جنس یا ہم کفو ہونے کی ہمہ جہتی نفی سے شرک فی الذات کا کامل سدِباب کر دیتی ہے۔ وہاں آیت الکرسی میں ذاتِ واجب الوجود کی صفاتِ کاملہ کا بیان ایسے پُرجلال اور پُرہیبت انداز میں ہوا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ شرک فی الصّفات کی جڑ کٹ جاتی ہے، بلکہ شرک فی العبادت کی راہ بھی کلیتہً مسدود

---

[1] مثلاً مسند دارمی میں حضرت ایفع ابن عبدالکلاعی سے روایت ہے کہ:۔

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ سُوْرَۃِ الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ؟ قَالَ: "قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ" قَالَ: "فَاَیُّ اٰیَۃٍ فِی الْقُرْاٰنِ اَعْظَمُ"؟ قَالَ: "اٰیَۃُ الْکُرْسِیِّ . . . . "

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا: "یا رسول اللہ! قرآن کی عظیم ترین سورت کون سی ہے؟" آپ نے فرمایا "قل ھو اللہ احد!" اس نے پھر عرض کیا "اور آیتوں میں سب سے زیادہ عظمت والی آیت کون سی ہے"؟ حضورؐ نے فرمایا "آیت الکرسی . . . "

ہوجاتی ہے۔

یہ آیہ مبارکہ دس مستقل جملوں پر مشتمل ہے :

پہلا جملہ ـــــ یعنی " اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ "، غیر اللہ سے صفتِ الوہیت کی کامل نفی کر دیتا ہے اور اس حقیقت کی وضاحت سے کہ اللہ ہی تنہا معبود برحق، مطلوبِ اصلی اور محبوبِ حقیقی ہے شرک فی العبادت کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ اس کا عام فہم مطلب یہی ہے کہ اللہ کے سوا معبودِ حقیقی کوئی نہیں تاہم عارفین کے نزدیک اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہی تنہا محبوبِ حقیقی بھی ہے اور مطلوب و مقصودِ اصلی بھی!

دوسرا جملہ ـــــ ذاتِ حق سبحانہٗ وتعالیٰ کے ان دو عظیم اسماء پر مشتمل ہے جن کے بارے میں بعض روایات[1] کی بنا پر گمانِ غالب ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے "اسمِ اعظم" کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی اَلْحَیّ، اور اَلْقَیُّوْم،

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اسمائے حُسنیٰ میں وہی باہمی تعلق ہے جو

---

[1] مثلاً مسند امام احمد میں حضرت اسماء بنت یزید سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں :

"سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ ھَاتَیْنِ الْاٰیَتَیْنِ : اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اِنَّ فِیْھِمَا اسْمَ اللّٰہِ الْاَعْظَمَ"

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دو آیتوں کے بارے میں یعنی ایک آیت الکرسی اور دوسری آل عمران کی پہلی آیت یہ فرماتے سنا کہ ان میں اللہ کا اسم اعظم ہے!

اس کی ہم مضمون روایات ترمذی، ابن ماجہ اور ابو داؤد میں بھی موجود ہیں (بحوالہ تفسیر ابن کثیر رح) ـــــ اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابو امامہؓ مرفوعاً نقل فرماتے ہیں کہ : اللہ تعالیٰ کا وہ اسم اعظم جس کے واسطے سے دعا مانگی جائے تو ضرور قبول ہوتی ہے۔ تین سورتوں میں ہے سورۂ بقرہ میں، سورۂ آل عمران میں اور سورہ طٰہٰ میں"، علماء کے نزدیک سورہ بقرہ اور آل عمران کی آیات تو وہی ہیں جو پہلی حدیث میں بیان ہوئیں اور سورہ طٰہٰ کی آیت ہے "وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ" اور ان تینوں آیات میں جو اسمائے حسنیٰ مشترک ہیں وہ اَلْحَیّ اور اَلْقَیُّوْم ہی ہیں!

"الاحد"، اور "الصّمد"، ہیں گویا ہے توحید ذاتی کے بیان میں اللہ تعالیٰ کی شان احدیّت کی نسبت تمام تر اپنی ذات ہی کی جانب ہے جبکہ اس کی شان صمدیت کا اظہار مخلوق کی نسبت سے ہوتا ہے اسی طرح توحید صفاتی کے ضمن میں خدا خود اپنی ذات میں تو "الحیّ"، ہے یعنی زندۂ جاوید اور از خود و بالخود قائم اور ماسوٰی کیلئے "القیّوم"، ہے یعنی ان کے وجود کا واحد سبب اور ان کے قیام اور بقاء کا واحد سہارا۔ گویا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود بھی خانہ ساز اور حیات بھی ذاتی اور ماسوٰی کا وجود بھی خالص عطائی اور حیات بھی نری مستعار!

تیسرے جملے ___ یعنی لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ میں اللہ کی صفت حیات کے کامل ہونے کی تصریح ہے۔ یعنی اس کی حیات ہر ضعف و احتیاج سے مستغنی ہے۔ چنانچہ نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ اس میں ایک مزید لطیف اشارہ ہو گیا اس حقیقت کی جانب کہ اللہ تعالیٰ کی صفات ذاتی ہونے کے علاوہ کامل بھی ہیں اور مطلق بھی، جبکہ ماسوٰی کی صفات وہبی اور عطائی ہونے کے ساتھ ساتھ ناقص بھی ہیں اور محدود بھی!

چوتھا جملہ ___ اللہ کی شان قیّومی کے لازمی منطقی نتیجے کی وضاحت پر مشتمل ہے یعنی جب جملہ موجودات کا عینِ وجود ہی اللہ تعالیٰ کی توجّہ کا مرہون منت ہے اور ان کے بقاء و قیام کا پورا دار و مدار ہی اس کی نگاہ کرم پر ہے تو لازماً یہ سلسلۂ کون و مکان کُل کا کُل اسی کی ملکیت ہے اور اسے ہی اس میں تصرّف کا کامل اختیار حاصل ہے گویا "لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ"، کے جامع الفاظ میں اللہ تعالیٰ کے "مَالِكُ الْمُلْكِ"، ہونے کا بیان بھی ہے اور "الْمَلِكُ الْحَقُّ"، ہونے کا اعلان بھی ___ یعنی بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری!

پانچواں جملہ ـــــ یعنی "مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ" یعنی کون ہے وہ جو سفارش کرسکے اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے؟ شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور اس سے جہاں یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ شفاعت ایک خالص عطائی اعزاز (BESTOWED HONOUR) ہے نہ کہ کسی کا ملکۂ نفسی یا استحقاقِ ذاتی، وہاں اُس شرک فی العبادت کی راہ بھی مسدود ہوجاتی ہے جو "ھٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآءُنَا عِنْدَ اللّٰہِ" کے بے بنیاد عقیدے کے تحت کیا جاتا ہے! یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر انداز بیاں حد درجہ پُرہیبت اور پُرجلال ہی نہیں، قدرے غیظ آمیز اور غضب ناک بھی ہے!

اللہ تعالیٰ کی شان الوہیّت و قیومیّت کے بیان اور اس کی صفاتِ جلیلہ میں سے وجودِ واجب، حیاتِ کاملہ، قدرتِ مطلقہ، ملکیّتِ تامّہ اور اختیارِ کلّی کی بالواسطہ تصریح یا براہ راست وضاحت کے بعد چھٹے اور ساتویں جملوں میں خالق اور مخلوق کے علم کے تقابل سے واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی بھی ہے اور کامل بھی، چنانچہ "مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ" کو بھی محیط ہے اور "وَمَا خَلْفَھُمْ" کو بھی جبکہ ماسوٰی کا علم ناقص اور محدود بھی ہے اور خالص وہبی اور عطائی بھی۔ چنانچہ چاہے جنّ ہوں یا انسان، اور خواہ اولیا و انبیاء ہوں یا ملائکہ و ارواح کسی کے پاس اپنا ذاتی علم کوئی نہیں۔ جو کچھ ہے صرف اللہ کی عطا اور اسؑ کی دین اور بس اسی قدر ہے جس قدر وہ چاہے اور عطا فرمادے "وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ"

آٹھویں اور نویں جملوں میں خدا کے غلبہ و اقتدار کی وسعت اور اسؑ کے قبضہ و اختیار کی ہمہ گیری کی ایک جھلک نہایت پُرشکوہ الفاظ میں دکھادی گئی ہے یعنی آسمانوں اور زمین کی تمام وسعتیں اسؑ کے حیطۂ اقتدار میں ہیں اور پورا سلسلہ کون و مکاں اسؑ کے زیرنگیں ہے اور وہؑ اس مملکت بے کراں کے حفظ و امان اور اس سلطنت بے پایاں کے

انتظام و انصرام سے ہرگز کسی درجے میں بھی عاجز اور لاچار نہیں!

آخری جملہ پھر دو عظیم اسمائے حسنیٰ پر مشتمل ہے جو "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا" کی عظیم حقیقت پر آخری مُہر تصدیق کے طور پر ثبت ہیں یعنی "وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ"، یعنی وہ تعالیٰ بلند و بالا بھی ہے اور بزرگ و برتر بھی اور صاحب عظمت و سطوت بھی ہے اور حامل شان و شوکت بھی۔

گویا اس آیہ کریمہ میں ذاتِ واجب الوجود کی صفاتِ جلیلہ میں سے قدرتِ مطلقہ اور اختیارِ کامل پر حد درجہ زور دینے کے علاوہ دو اہم صفات یعنی حیات اور علم کے حوالے سے یہ بنیادی حقیقت واضح کر دی گئی کہ حضرت حق سبحانہٗ کی صفات اس کے وجود ہی کی طرح ذاتی بھی ہیں اور غیر محدود و لامتناہی بھی جبکہ ماسوٰی کی صفات ان کے عین وجود کے مانند خالص عطائی بھی ہیں اور نری محدود اور مقیّد بھی۔ گویا اس کا وجود بھی حق اور صفات بھی حقیقی اور ہمارا وجود بھی محض وہمی[1] اور صفات بھی فقط اعتباری!

اس طرح قرآن حکیم کی یہ آیت عظیمہ وجود، حیات، قدرت اور علم ایسی بنیادی صفات کے ضمن میں ذات باری تعالیٰ کی شان یکتائی کے بیان میں منفرد مقام کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت بھی قرار دیا ہے اور جملہ آیات قرآنی کی سردار بھی[2]!

---

[1] كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَال
اَوْ عُكُوسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَال

[2] ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے تو قرآن کی چوٹی سورۂ بقرہ ہے اور اس میں ایک آیت (یعنی آیۃ الکرسی) تمام آیاتِ قرآنی کی سردار ہے!"

مولانا ڈاکٹر غلام محمد

اسلام کا نظامِ روحانی

—— یہ مقالہ مارچ ۸۸ء میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پڑھا گیا ——

الحمد للہ الاحد الواحد القدیم والصلوٰۃ والسلام علیٰ حبیبہ الافخم سیدنا ومولانا محمد النبی الامی وعلیٰ آلہ و صحبہ اجمعین — امابعد

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں ایک حقیقتِ امری کی نشاندہی یوں فرمائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ	جب کہ (اے محمدؐ) آپ کے رب نے
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَ	اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا
اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ج	اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کیا
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ط قَالُوْا بَلٰی ج	میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے
شَهِدْنَا ج اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ	جواب دیا کیوں نہیں، ہم سب گواہ ہیں
الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا	کبھی کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس
غٰفِلِیْنَ ○	سے محض بے خبر تھے!

بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[1] یہ تخم ہدایت کی وہ کاشت تھی جسے کل آسمانی تعلیمات کے مبداء ومنتہا کا وجودِ مجمل کہنا چاہیئے، اس کو عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے عام افراد میں بکھیر دیا گیا تاکہ آئندہ ہر آدمی وحی الٰہی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے

قرآن نے عہد الست کا ذکر کیا ہی اس لئے تاکہ انسان اس کو خوب یاد رکھے، اس کو

---

[1] تفسیری حواشی بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

اپنے راہِ حیات کا چراغ اپنی منزل کا نشان اور اپنے پرکارِ عمل کا مرکز و محور بنائے۔ اس کی یاد تازہ ہے تو عرفانِ نفس بھی حاصل ہے اور عرفان رب بھی، اس کی یاد ہمارا ہوش اور اس کی فراموشی ہماری بیہوشی ہے۔ غور کیجئے کہ اسی عہد سے ہمیں پتہ چلا کہ:

۱۔ ہماری اصل یا ہمارا وجود عبارت ہے روح سے۔

۲۔ ہمارا وطن عالم ارواح ہے جو ہماری ناسوتی حیات کی نسبت سے آخرت ہے۔

۳۔ ہماری منزل قربِ الٰہی اور ہمارا آبِ حیات مشاہدۂ ربانی ہے۔

۴۔ ہمارا خمیر عشقِ الٰہی سے اٹھایا گیا ہے (یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ) محبتِ الٰہی کے بغیر ہماری زندگی لفظِ بےمعنی اور ذکرِ الٰہی کے بغیر ہمیں چین میسر نہیں آ سکتا (اَلَا بِذِكْرِ اللهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ)

۵۔ ہمارے سفر کا مبداء و معاد یا مصدر و مرجع اَلَسْتُ و بَلٰی والا نقطہ ہے، یہی اَنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کا حاصل بھی ہے اور عارفِ رومی نے اسی کی ترجمانی کی ہے ؎

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگار وصلِ خویش

۶۔ عہدِ الست ہی کے ذریعہ انسان توحید کا دائماً مکلّف بنا، اگر یوم الست مکلف نہ بنتا تو اس دنیا میں آکر اس کا مامور بہ توحید رہنا ناممکن ہو جاتا اور رب الوہیّت کا اقرار نہ ہو سکتا تو دنیوی اعمال پر جزا و سزا بلکہ فی نفسہ خیر و شر کی واقعی تمیز تصوّر سے باہر رہتی۔

مذکورۂ بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جب تک عہدِ الست ہمارے انفرادی و اجتماعی، دنیوی و اخروی اعمال کا مرکز و محور ہے۔ اس وقت تک ہم عبداللہ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہیں اور جہاں اس محور سے ہٹے اور جب تک ہٹے رہے ہم شرف انسانی سے گر کر کہیں کے نہ رہے، کالانعام بل ھم اضلّ کا مصداق بن گئے۔!

؎ ہش دار کہ راہ خود گم نہ کنی

ان حقائق کو سمجھ کر اب آئیے روح کے سفر ناسوتی کا جائزہ لیں۔ انسان اوّل یعنی حضرت

آدم علیہ السلام جب وطن اصلی سے نکل کر اس زمین پر اترآئے چونکہ وہ انسان اول کے ساتھ ساتھ نبیٔ اول بھی تھے، ان کی روح مزکّی اور ان کا قلب مصفّا تھا اس لئے مادی حجابات ان کے لئے شفاف شیشے تھے، وہ مہجورِ وطن ہوکر بھی وطنی لذتوں سے سرشار تھے۔ قربِ الٰہی بھی حاصل تھا اور مکالمۂ ربّانی سے بھی مشرف تھے، مگر ان کی ذرّیت جو پھیلی اور پھیلتی چلی گئی وہ ناسوتی حجابات میں آکر اپنے وطن، وطن کی بہار، اپنی تخلیقی غایت، اپنے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کو یکسر بھلا بیٹھی، علم سے عاری ہوکر جہل میں اور عرفان سے محروم ہوکر فریبِ نظری میں مبتلا ہوگئی۔ آدم زادوں کو ان ظلماتِ عارض سے نکال کر الست کا سبق یاد دلانے اور حقائق الست کو ان پر بے نقاب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہادیانِ حق بھیجے اور بالآخر خاتم النبیین، سردارِ رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایتِ ازلی کے اکمال و اتمام کے لئے مبعوث فرمایا۔ وہ تشریف لائے اور حیات کے دھارے پر آنکھیں بند کئے بہی جانے والی انسانیت کو چونکا دیا، حیات کی اس عارضی موڑ پر جس کا نام دنیا ہے رہنے اور گذر جانے کا ڈھنگ سکھایا، اپنی ذات اور اپنے طرزِ حیات کو گواہ ٹھہرا کر انہیں سفرِ آخرت کا شعور بخشا، فرمایا:

مالی وللدنیا ما انا فی الدنیا	مجھے دنیا (کی لذتوں راحتوں) سے کیا
کراب استظل تحت شجرۃ ثم	سروکار، دنیا میں میری مثال اس سوار مسافر
راح وترکھا	کی سی ہے جو سایۂ شجر میں ستائے اور
	چلتا بنے۔

اور حکماً فرمایا:

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر	دنیوی زندگی تو بس اجنبیانہ اور مسافرانہ
سبیل۔	طور پر بسر کرو!

یہ اپنی طرف سے فرمایا اور اس کے ساتھ الٰہی تنبیہات بھی سنائیں مثلاً فرمایا کہ دیکھو اللہ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا	جس نے ہر اقدام میں، آخرت کی نیت
وھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ	رکھی اور اس کے لئے کوشش کی جیسا

سَعْیُھُمْ مَشْکُوْرًا۔ (الاسراء۔ ۱۹) | کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہو تو ایسے ہی لوگوں کی مساعی نگاہِ حق میں قابلِ قدر ٹھہریں گی

غور کیجئے کہ یہی سفرِ آخرت کا ہمہ وقتی شعور رہے جو مسلمان کے زہد، ورع، تقویٰ، مصیبت میں صبر، راحت میں شکر، فقر میں شاہی اور شاہی میں فقر و بے نیازی کا ضامن ہے، کیونکہ منزل دوست مسافر کی نظر راستہ کی تکلیف یا راحت پر کب ہوتی ہے، بقول ہمارے شیخ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ:

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

اس مرحلہ پر اس فرق منازل کو بھی ذہن میں لائیے کہ انسان یا تو اپنے وطن میں صرف مشاہدۂ ربانی میں مگن تھا یا تاریک دنیا میں آکر "مجاھدہ" کا پابند کر دیا گیا، امتحان میں ڈالا گیا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (الملک۔ ۲) — اسی نے موت و حیات پیدا کی تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

جہاں روشنی تھی مطالبۂ عمل نہ تھا، جب تاریکی میں گھر گئے تو مجاہدہ واجب ٹھیرا، اب بے بصر و بے خبر انسان منزل کی طرف چلے تو کیوں کر چلے، اس کی اسی ہدایت کے لئے قرآن پاک اتارا گیا جو فرقان ہے کہ حق کو حق باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے، جو نور ہے کہ راہِ آخرت کو روشن کرتا ہے، جو شفا ہے کہ نفس کے روگ کو دور کر کے اس کے ذائقہ کو درست کرتا اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفتِ حق کے قابل بناتا ہے۔ جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت سے بدل دیتا ہے۔ جو ھُدیٰ ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولیٰ سے ملا دیتا ہے۔ مگر غور کی بات یہ ہے کہ یہ ربانی نظامِ حیات اور یہ کلام اللہ اترا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر ہی پر تھا، اور وہیں جمع ہو کر جب نطقِ نبویؐ سے اس کا اظہار انسانیت پر ہوا تو بہ ظاہر انسان کا کان اس کو سن رہا تھا مگر اس کا اثر صرف وہیں ہو رہا تھا

جہاں اثر پذیر دل موجود تھا، خود قرآن کہہ رہا ہے:

لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ	ہر اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو
(ق - ۳۷)	

یہ کیوں؟ اس کا جواب عالمِ ربانی علامہ ابنِ قیم یہ دیتے ہیں کہ:

فصاحب القلب الحی بین	اس لئے کہ زندہ قلب والے کے
قلبه وبین معانی القرآن	قلب اور قرآنی معانی میں اتصالِ اتم
اتم الاتصال	پایا جاتا ہے۔

اور فرماتے ہیں کہ یہاں آیتِ پاک میں قلب سے مراد "قلبِ بیدار" ہی ہے نہ کہ دلِ مردہ۔

والمراد به القلب الحی الذی	اور یہاں قلب سے مراد زندہ قلب
یعقل عن الله، کما قال الله	ہے جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو جیسا
تعالیٰ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ	کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، یہ تو
مُّبِيْنٌ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا	خالص نصیحت اور صاف پڑھی جانے
— ای حی القلب[۹]	والی کتاب ہے تاکہ ہر اس شخص کو ڈرائے

جو زندہ ہو — یعنی زندہ دل رکھنے والا ہو۔

معلوم ہوا کہ اصلاً اور آخر کار ہدایت پذیری کا تعلق قلبِ انسانی سے ہے جو اس دنیا میں روح کی آنکھ اور اس کا حاسۂ ادراک ہے۔ ثانی طور پر البتہ اسی آیت میں اثر پذیری کی ایک صورت یہ تبلائی گئی ہے:-

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ	یا جو کان دھر کر توجہ سے سنے
(ق - ۳۷)	

یہاں کان اور دھیان کو قلب تک ہدایت رسانی کے وسائل قرار دیے گئے ہیں، باقی حیات اور ہدایت پذیری تمام تر قلب ہی سے متعلق ہے۔ اسی لئے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم

---

۹ التفسیر القیم مرتبہ مولانا محمد ادریس نگرامی ندویؒ

نے فرمایا :-

الا ان فی الجسد لمضغة اذا	سن رکھو کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے
صلحت صلح الجسد کلہ و	جب وہ سدھر جاتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے
اذا فسدت فسد الجسد کلہ	اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا
الا وھی القلب	ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے !

اسی قلب کو تقوے کا مرکز بھی بتلایا، اس طرح کہ اپنے دست مبارک سے اپنے قلبِ اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

و تقوٰی ھٰھنا	تقوٰی کی جگہ یہ ہے ۔

بہتر سے بہتر ضابطۂ حیات انسان کو انسانِ کامل نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کی تنفیذ میں اندر سے باہر، قلب سے جوارح، نیّت سے عمل، شعور داخلی سے ثبوت خارجی اور فرد سے اجتماع کی طرف کا اصول نہ برتا جائے۔ یہی تمام ہادیانِ برحق اور خود ہادیٔ اعظم و خاتم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت و تبلیغ کا اصول رہا اور اسی کی پیروی ہم پر لازم قرار دی گئی۔

اب آئیے ایک اور حقیقت پر غور کریں، عالمِ ارواح میں گو ہم قیدِ زمان و مکان سے باہر نہیں تھے مگر وہ زمانِ الٰہی سے الگ ایک زمانِ غیر زمانی اور مکان نا متناہی تھا، نہ وہاں، ماضی، حال، مستقبل تھا، نہ یہ تشکیلیں تھیں نہ صورتیں، عمل مشاہدہ تھا مگر بلا صورت عمل کے، مکالمہ تھا مگر بلا لسان و صوت کے، مگر سفرِ حیات کی ناسوتی منزل میں پہنچ کر روح پابند جسم ہو کر اعمال کی صورتوں کے تعیّن پر مجبور ہو گئی۔ جس کو اسلام اعمالِ صالحہ قرار دیتا ہے۔ وہ بھی اس سے مستغنٰی نہ رہ سکے گو مقصودِ اصلی ان کی حقیقت یا روح ہی رہی مگر چونکہ اس عالم میں کوئی روح بلا قالب پائی نہیں جا سکتی اس لئے وہ قالب بھی مطلوب رہے۔ استاذ فلسفہ صوفیٔ صافی بزرگ حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ فرماتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ کسی شے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنی سے ہوتا ہے .... جس طرح " انسانِ کامل" کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن یا قلب و قالب، اسی طرح " دینِ کامل" کے بھی دو رُخ ہیں، شریعت و طریقت

اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوّف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ تصوّف نام ہے باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ ارکان کی ایک ظاہری صورت ہے جس کے احکام فقہ میں بیان ہوئے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع، حضورِ قلب یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ) قلب و باطن کے اعمال ہیں۔ جس طرح اکل و شرب، روزہ کا ظاہر ہے اسی طرح اس کا باطن (لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ) ہے، پھر جس طرح مختلف اعمال شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں (الاعمال بالنیات) اور درجاتِ اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں[1]

غرض عالم ناسوت میں ہمارا وجود جس طرح روح مع الجسد کا نام ہے اسی طرح یہاں ہمارے اعمال کا اعتبار بھی مخصوص معنویتوں کے ان کے مخصوص اشکال کے ساتھ جمع ہونے ہی میں متصور ہو سکتا ہے۔ اسی نکتہ کو نہ سمجھنے سے مسلمانوں میں اہلِ ظواہر اور اہلِ باطن کے دو گروہ پیدا ہوئے اور دونوں حقیقت سے بیگانہ رہے۔ شیخ الشیوخ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"عبادت کی روح محبت و عشق ـــــ یہ سب جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق نہیں پایا جا سکتا، کلّی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی، جس طرح کہ انسان جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں روح (عمل) یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عملِ ظاہری کے ہو۔ کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں، بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عملِ ظاہری کے ہوں، پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ شخص نہیں اور کلّی من

---

[1] تجدیدِ تصوف (مطبوعہ لکھنؤ) صفحات ۴ تا ۶۔

حیث ہو کلی کا وجود ہوتا نہیں، پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی ..... اور اگر کوئی عمل ظاہری کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی تو اسے مدعی وہی صورت کیوں قبول نہیں کرتا جو محبوب نے تجویز کی ہے، جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزۂ محبوب سے اچھی کونسی صورت ہوگی ؟" [1]

ایک اور موقع پر فرمایا:

" اس بات سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکمِ خداوندی ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں۔ کیا اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اِصبروا ، واشکروا ، امر کا صیغہ نہیں ؟ کیا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ سے روزے کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ سے محبتِ الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود و موجبِ نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔"

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (الشمس ۹)	بے شک جس نے نفس کو صاف کیا وہ کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا، ناکام رہا۔
یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (الشعراء - ۸۸)	جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے بجز اس کے کہ جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجبِ فلاح اور دوسری میں سلامتیٔ قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے۔" [2]

غرض اس جمع اضداد دنیا میں آکر حیاتِ انسانی کو عام حیاتی سطح سے جو دراصل سطحِ حیوانی ہے ایمانی سطح پر لانے کے لئے جو دراصل سطحِ روحانی ہے یا یوں کہئے آلودہ زندگی کو "حیاتِ

---

[1] وعظ مسمّٰی بہ "روح الارواح" [2] رسالہ "حقیقتِ تصوف" از حضرت تھانوی

طیبّبہ" والی منزل میں پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ معلّم اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بیک وقت صورتِ اعمال بھی حاصل کی جائے اور روحِ اعمال بھی جذب کی جائے۔ صورت اعمال تو قرآنی و حدیثی صراحتوں اور حضور انورؐ کے نمونۂ اعمال سے ملیں گی، جس کا درس ہر عالم دین سے مل سکتا ہے۔ البتہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت منجذب ہو کر منتقل ہوتی آرہی ہے، کسی مستند صحبت یافتہ اور مجاز صحبت بزرگ ہی سے بطریق انجذاب حاصل کی جاسکتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک لاکھ سے زائد دورِ نبویؐ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا شرف "صحابیت" ہی ہے اور اس شرف میں اس طبقہ مقدس کے عالم و عامی، شمشیر زن اور شاعر، صفہ نشین اور صاحبِ خلافت سب برابر ہیں، اسی فیضانِ صحبتِ نبوّی نے انہیں 'احسان' کے مرتبہ اعلیٰ تک پہنچایا تھا، ذات حق، اور جنت و دوزخ گویا ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور ان کی وطن اصلی سے مہجوری صرف ضابطہ کی رہ گئی تھی، ظاہر و باطن کی یہ جامعیّت خلفائے راشدین کے زمانہ تک برقرار رہی۔ پھر اموی خلفاء نے شریعت کے صرف ظاہری قوانین کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری قرار دے کر تزکیۂ نفس اور صحبت کے ذریعے روحِ اعمالی کی منتقلی کے فریضہ سے دست بردار ہوگئے، اس دور کے آغاز سے ظاہر و باطن میں تفرقہ پڑگیا۔ ظاہر شریعت کا نام فقہ اور باطن شریعت کا نام بعد کو تصوّف پڑگیا۔ اموی خلفاء کے اس حال کو دیکھ کر جن حضرات نے باطنی تربیت اور فیضانِ صحبّت کا کام سنبھالا وہ پہلے زہاد پھر عباد پھر صوفی کہلائے، اور حقیقت یہ ہے کہ پھر انہی کے ذریعہ آئینِ محمّدی کو دنیائے دارالامتحان میں عملی کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ انہی نے فقیری میں شاہی کی۔ اور بادشاہتیں پا کر فقیرانہ طرزِ حیات کے نمونے پیش کئے، کامیاب زندگی جو عبارت ہے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جامع ظاہر و باطن اسوۂ حسنہ کی پیروی سے، اس کی تحصیل کا طرز قطبِ ربّانی محبوبِ صمدانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرّہٗ یہ بتلاتے ہیں کہ :-

کُن مع اللہ عزوجل کَانَ لَاَّ	اللہ کے ساتھ اس طرح رہ گویا مخلوق
خلق و مع الخلق کَانَ لَاَّ نفس،	موجود ہی نہیں اور مخلوق کے ساتھ
فاذا کنت مع اللہ عزّوجل	اس طرح رہ گویا نفس موجود ہی نہیں
بلا خلق وجدتّ دعَنـ	پس جب تو مخلوق کے بغیر اللہ کے ساتھ

الکل فنیت واذا کنت مع الخلق بلا نفس عدلت و اتقیت وعن التبعات سلمت
(فتوح الغیب ۔ مقالہ ۷۷)

ہوگا تو تو اللہ کو پائے گا اور سب سے فنا ہو جائے گا اور جب تو بلا نفس کے مخلوق کے ساتھ ہوگا تو تو عدل کرے گا اور حق پر قائم رہے گا اور برے انجام سے محفوظ رہے گا۔

اسم بامسمّٰی حضرت محی الدین الجیلی قدس سرّہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی میں نے نقل کر دی اور آپ نے سن لی مگر فرق یہ ہے کہ یہ عاجز یہ اطلاع پہنچا کر آپ کو اس حال کا صاحب حال نہیں بنا سکا جبکہ حضرت شیخ نے اپنی صحبت اور فیضانِ نظر سے اپنے مخاطبین کو اس مقام تک پہنچا کر "انسانِ کامل" بنا دیا تھا۔ آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہو تو وہ کسی قائد سے نہیں، معقولی سے نہیں، نرے مولوی سے بھی نہیں بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفیٔ صافی کی صحبت بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا، اس کی صحبت سے قلب کو جلاء ملے گی، اس میں نور آئے گا اور پابندِ جسد روح پھر اس نورانی حاسہ سے اَلَستی حقائق کو "کانک تراہ" پانے لگے گی، پھر یہی شخص ہوا و ہوس سے نکل کر صاحب عدل ہوگا۔ اور کوئی دنیوی تحریص اس کو "حق" سے ہٹا نہ سکے گی یہی باکمال انسان ارضی خلافت کا فریضہ انجام دے سکے گا، دنیوی اقتدار اس کو منجانب اللہ ملے گا کیونکہ اللہ پاک سے زیادہ وعدہ کا سچا کوئی نہیں، اور اس کا وعدہ ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (الانبیاء : ۱۰۵)

اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔

اور جب اقتدارِ خلافت کی باگ ایسے "کامل انسان" کے ہاتھ میں آئے گی تو دنیا اس خلیفہ کے اندر ربانیہ تجلیات کا پرتو کھلی آنکھوں سے دیکھے گی، جیسا کہ رازدانِ حقیقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

الخلیفۃ من یمشی شریعۃ النبی فی الناس ولیظہر علی یدہ موعود اللہ لنبیّہ ظہورے دارد و لطفے،

خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو لوگوں میں جاری کرے اور اس کے ہاتھ پر خدا کے وہ وعدے جو اس کے نبی کے ساتھ تھے پورے ہوں۔

ظہرش تمشیت است و بطنش داعیہ
ایست قویہ کہ بواسطۂ پیغمبر در دل
او متمکن شدہ بلکہ از جذرِ دلِ او
جوشندہ اگر ایں داعیہ از دلِ کسے
نجوشد او را خلیفۂ خاص نمی تواں
گفت [1]

اس کی ایک ظاہری صورت ہے اور
ایک باطنی، ظاہری صورت احکام
نبی کا نافذ کرنا ہے اور باطنی صورت
وہ قوی داعیہ ہے جو بواسطۂ پیغمبر
اس کے دل میں جاگزیں ہو بلکہ دل کی
گہرائی سے جوش زن ہوتا ہے جس کے
دل سے یہ داعیہ جوش زن نہ ہو، اس کو خلیفۂ خاص نہ کہیں گے۔

یہ ہے اسلام کے روحانی نظام کی اجمالی اطلاع جس کی جسارت محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک و اصرار پر راقم عاجز کو کرنی پڑی، ورنہ جو معلومات اوپر فراہم کی گئیں ان سے حقیقتِ حال کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ روحانی نظام قیل و قال کی چیز نہیں بلکہ یہاں عارف رومیؒ جیسے دیدہ ور کی یہ تاکید ہے ؎

قال را بگذار، مردِ حال شو = پیشِ مردے کاملے پامال شو

نظامِ روحانی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی مستند صحبت یافتہ صاحبِ مشاہدہ بزرگ کی صحبت اختیار کی جائے، حضرت علی متقیؒ، صاحب کنز العمال بڑے محدث بھی ہیں اور ولیٔ کامل بھی، وہ اپنے دریا بہ کوزہ رسالہ "تبیین الطرق الی اللہ" کو اس فقرہ پر ختم فرماتے ہیں۔

واما احتیاج الناس الی المرشد
والاستاذ فلابد منه لتحصیل
الطریق وسرعة الوصول واما
سلوك الطریق بغیر المرشد
والاستاذ فهو فی الجملة ممکن
لمن وفقه الله بموجب قوله
"وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا

حصولِ طریقت اور سرعتِ وصول
کے لئے کسی مرشد و استاد کی حاجت
ضروری ہے کیونکہ گو فی الجملہ بغیر مرشد
و استاد کے بھی جس کو خدا توفیق دے
سلوک و طریقت میں کامیابی ہو سکتی ہے
جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ
ہمارے لئے ہماری راہ میں کوشش کرتے

---

[1] ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ جلد اوّل فصل سوم

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ' بتعب شديد ومدة طويلة وهو نادرًا جدًا[1]

ہیں یقیناً ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں" مگر یہ بڑے مجاہدے اور مدتِ دراز کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی بہت ہی شاذ و نادر۔

ظاہر ہے کہ نادر کو کلیہ کی حیثیت نہیں دی جاسکتی نہ کوئی عاقل قاعدۂ کلیہ کو چھوڑ کر مستثنیٰ کے درپے ہونا گوارا کرے گا۔ یہاں صحبت ازبس ضروری ہے اور صحبت بھی ایسے کی جس کا سلسلۂ صحبت، صحبتِ نبویؐ تک متصل ہو۔ سب جانتے ہیں کہ سلسلۂ سند کا اہتمام یا تو محدثین میں ہے یا پھر شیوخِ طریقت میں اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محدثین کرام کو یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ اقوالِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر نبی کے اقوال کی ملاوٹ سے پاک رہیں اور شیوخِ طریقت کو یہ حزم دامن گیر ہے کہ صحبتِ نبویؐ کے فیوض، برکات اور انوار خود ساختہ مصلحین کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک رہیں۔

اب رہا یہ اشکال کہ جب یہ علم صحبتی علم ہے تو اس موضوع پر اکابر شیوخ کی اتنی کتابیں کیوں ملتی ہیں۔ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ جن اکابر صوفیاء نے یہ کتابیں تصنیف فرمائیں وہ مدارس کے لیے تھیں نہ عام مسلمانوں کے لئے بلکہ وہ صرف طبقۂ سالکین کے لئے تھیں تاکہ دورانِ مجاہدہ و سلوک انہیں جو اشکالات پیش آئیں انہیں رہبری حاصل رہے یا جو احوال و عبقات یا مشاہدہ و مکاشفات حاصل ہوں ان کی حقیقت کو سمجھ کر تصدیق یا بصورت دیگر تصحیح کی سہولت حاصل رہے۔ ان کتابوں پر اور ان صوفیانہ اصطلاحات پر جو زمانہ بہ زمانہ وضع ہوئیں اور برتی گئیں اصل نظامِ روحانی کا جو نبی امی فداہ ابی امی کی صحبت بابرکت، فیضانِ نظر اور انفاس قدسیہ سے صحبتِ متواترہ کے ذریعہ ملا ہے، قطعاً دارومدار نہیں، اسی لئے محمد غزالی ہوں یا جلال رومی، فخر رازی ہوں یا برکات احمد

---

[1] یہ رسالہ مخطوطہ شکل میں تھا۔ اس کی اوّلین اشاعت کی سعادت راقم الحروف کے حصہ میں آئی۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ "البعث الاسلامی" (لکھنؤ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء (اغلباً) میں چھپا، پھر اردو ترجمہ کے ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت ماہنامہ "بیّنات" (کراچی) بابت فروری ۱۹۶۴ء میں ہوئی جب اس کی ادارت میرے ہاتھ میں تھی۔

ٹونکی سرِ طالب تزکیہ و تصفیۂ باطن کو یہاں اوّلین انتباہ یہی ملتا ہے کہ ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کُن　　سینہ را از نورِ حق گلزار کُن

افسوس کہ عہدِ اَلَست اور طریقت کے ناآشنا دانشور، ریسرچ سکالرز، الٰہیات میں عقلی گھوڑے دوڑانے والے فلسفی اور تخیّلات کے پتنگ اڑانے والے شاعر اور مستشرقین کے پیروؤں کے ہاتھوں میں صوفیائے کرام کی یہ کتابیں پہنچ کر عجب مضحکہ خیز رائے زنی اور ردّ و قبول کا شکار ہو گئی ہیں، ان حرف زنوں کی نہ تصدیق معتبر نہ تکذیب معتبر بلکہ آشنائے حقیقت یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہے کہ ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را　　چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اللہ تعالےٰ ان " ضلوا و اضلوا "[1] کے مصداق مدعیانِ افہام و تفہیم کے فتنہ سے اہلِ اسلام کو بچائے، اور اَلَستی حقائق کے متلاشیوں کو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ آئیں، شیخ اکبرؒ کے سے کسی واقف اسرار کی صحبت میں پہنچائے، اس سے پیشتر کہ وہ مکتوباتِ سی صدی کو سمجھنے کی کوشش کریں شاہ شرف الدین یحییٰ منیر کی سند صحبت رکھنے والے کی خدمت میں بار عطا کرے، اس کے بجائے کہ وہ مکتوباتِ امام ربّانی اور معارف لدنیہ اپنی فہم نارسا سے دیکھیں انہیں مجدّد الف ثانی والے صاحبِ فیض کی توجہ کا مورد بنائے۔ اس کے بجائے کہ وہ فیوض الحرمین اور سطعات و ہمعات کو سمجھنے کی کوشش کریں انہیں وقت کے کسی ولی اللہ کا فیضانِ نظر بخشے، اس سے پہلے کہ کوئی مولوی صاحب قرآن کے تصوّرِ تزکیۂ نفس یا تصوّرِ تقویٰ پر قلم رانی کا تہیّہ کریں انہیں شاہ اشرف علی تھانوی جیسے صاحب نظر و خبر کی صحبت میں آکر نورِ نظر اور مشاہدۂ حقیقت حاصل کرنے کی توفیق بخشے تاکہ ان کی خدمات سے ملّتِ اسلامیہ کو قرنِ اوّل والا نفع حاصل ہو،

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من
لدنك رحمة انك انت الوھاب

---

[1] ترجمہ: "تحقیق کہ خود بھٹکے اور دوسروں کو گمراہ کیا"۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں جو قیامت کے قریب پیدا ہونے والے بے بصر اہلِ علم اور ان کے خطرے سے بچانے کے لئے حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائے تھے۔

- یہود نے عہدِ صدّیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا،
آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنادیا
- وہ آج بھی قاتل خلیفہ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سیّد الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟

تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں
کا مطالعہ کیجیے:

① **سانحہ کربلا:** حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

② **شہیدِ مظلوم:** حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت صرف -/۹ روپے (سستا ایڈیشن -/۴)
قریبی بک سٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون نمبر: ۸۵۲۶۸۳

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

اراضی پاک و ہند کی شرعی حیثیت

—— یہ مقالہ مارچ ۸۸ء میں منعقدہ سالانہ محاضراتِ قرآنی میں پڑھا گیا ——

جناب صدر گرامی! محترم امیر تنظیم اسلامی، معزز رفقائے تنظیم اسلامی و دیگر قابل قدر حاضرین کرام۔

"محاضرات قرآنیہ" کے سلسلے کی اس علمی و فکری نشست میں راقم الحروف اپنی اس حاضری کو باعث سعادت تصور کرتا ہے اور محترم امیر تنظیم اسلامی اور ان کے جواں ہمت رفقائے کار کی خدمت میں قرآنی علوم و افکار کو عام کرنے کی اس فیاضانہ کاوش پر پر خلوص ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ امت مسلمہ کو فکر قرآنی کو جاننے، ماننے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

"اسلامی معاشیات" کی اس فکری نشست کے لئے میرے مقالے کا عنوان "اراضی برعظیم پاک و ہند کی شرعی حیثیت، قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے فتاویٰ کی روشنی میں" ہے، لیکن اپنے اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں "قاضی صاحب" قدس سرہ کے علمی و فکری مقام کی طرف چند اشارات کرتا چلوں، تاکہ ان کے حوالے سے جو بات کی جائے سامعین کو اس کی قدر و منزلت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

قاضی صاحب مغلیہ سلطنت کے دور زوال اور محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواح ۱۱۴۰ھ/۲۸-۱۷۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں وفات پائی، وہ پدری رشتے سے ۳۲ واسطوں کے ساتھ حضرت عثمانؓ کی اور مادری سلسلے سے چالیس پشتوں کے ساتھ میزبان نبوی حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد ہیں۔ پانی پت میں ان کا خاندان ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں ایران کے راستے سے خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی کے توسط

سے پہنچا۔ یہاں اس خاندان نے علمی وفکری طور پر بہت ترقی کی۔ ان کے جدّی سلسلے کو مخدوم شیخ جلال الدین کبیر الاولیا عثمانی ' چشتی کی وجہ سے اور مادری خاندان کو شیخ عبداللہ انصاری المعروف بہ پیر ہرات یا پیر ترکستان کے باعث خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ قاضی صاحب کے اپنے بیان کے مطابق ان کے اس خاندان میں قریب قریب دس پشتوں سے علم کا سلسلہ متوارث چلا آتا ہے' جبکہ ان کی تین پشتوں سے پانی پت کی "قضا" کا شعبہ ان کے خاندان سے متعلق تھا' قاضی صاحب کے نانا نواب لطف اللہ خاں صادق بہادر تہور جنگ' دربار مغلیہ کے شش ہزاری منصب دار تھے اور ان کے ماموں نواب شاکر خاں مغلیہ حکمران "شاہ عالم" کے دیوان اور خصوصی معتمد علیہ تھے۔

قاضی صاحب علمی وفکری دنیا میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس صدی کے بہترین علماء وفضلاء سے علم حاصل کیا' ان کے اساتذہ کی فہرست میں قاری محمد صالح المصری تلمیذ شیخ عبدالخالق المتوفی' شیخ محمد فاخر محدث الہ بادی تلمیذ شیخ محمد حیات السندی' شیخ مرزا مظہر جان جاناں دہلوی تلمیذ شیخ محمد افضل محدث سیالکوٹی اور امام العصر شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی جیسے اکابر علم شامل ہیں' مؤخر الذکر یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے انہیں خصوصی شرفِ تلمّذ حاصل تھا' شاہ صاحب کے تمام شاگردوں میں شاید ہی کوئی ایسا شاگرد ہو جو اپنی تصانیف' علمی وفکری تحقیقات اور خاص طور پر فقہ واجتہاد میں ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہو ۔ ان کے علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز سا بالغ نظر محدث ان کو "بیہقی وقت" اور مرزا مظہر سا شیخ کامل "علم الھدای" (نشان ہدایت) کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ انہیں مرزا مظہر سے یہ منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ اگر روز قیامت اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ پوچھیں گے کہ میں اسکی بارگاہ میں کیا تحفہ لے کر آیا ہوں تو میں قاضی صاحب کو بارگاہ خداوندی میں پیش کروں گا۔

انہوں نے مختلف موضوعات پر ۳۶ کے قریب کتابیں تصنیف فرمائیں' جن میں ان کی عربی تفسیر تفسیر مظہری سب سے نمایاں ہے۔ یہ تفسیر بہت سے امتیازی اوصاف کی حامل ہے' اور یہ بلاشبہ ہندوستان بھر میں تصنیف کی جانے والی پہلی مکمل عربی تفسیر ہے ۔ اور یہ ہندو پاک کے علماء کی ان کاوشوں میں سے ایک ہے' جسے ہندو پاک بجا طور پر عرب دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔

اس عظیم تفسیر کے مؤلف نصف صدی کے قریب پانی پت کے قاضی وجج بھی رہے۔ اپنی اس حیثیت میں انہیں فقہ اور مسائل فقہ کے مطالعے اور اس کے نفاذ دونوں کے مشاہدے کا موقع ملا۔ بعض اوقات دربار شاہی کے فیصلے بھی ان کی فقہی رائے پر موقوف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہر مکتب فکر کے ہاں ان کا یکساں ادب واحترام کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اراضی بر عظیم پاک وہند کے بارے میں ان کی رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اراضی ہند کا تاریخی پس منظر

اراضی ہندوپاک پر شرعی حیثیت سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کے تاریخی پس منظر پر کچھ روشنی ڈالوں۔ فقہی اعتبار سے مسلمانوں کی مفتوحہ اراضی کو دو بنیادی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ قسم اول میں وہ اراضی آتی ہیں جو مسلمانوں نے صلح ومعاہدہ کے ذریعے حاصل کیں، مثلاً نجران، ایلا، اذرج وغیرہ کے علاقے اس قسم کی زمینوں کے معاملے میں معاہدات ہی پر عمل کیا جاتا ہے جبکہ قسم ثانی میں ایسے علاقے شامل ہیں جنہیں مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کیا اور وہاں اسلامی حکومت قائم کی۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی بیشتر زمینیں اسی قسم میں شامل ہیں ۔ آج کی اس نشست میں یہی قسم ہماری اس بحث وتمحیص کا موضوع ہے۔

سیاسی وجغرافیائی مجبوریوں کے تحت مسلمانوں نے بر عظیم پاک وہند کی سرزمین کو کئی قسطوں میں فتح کیا۔ اس "فتح مبین" کی ابتدا نوجوان جرنیل اور فاتح محمد بن قاسم نے ۹۳ھ/۷۱۲ء میں حملۂ سندھ سے کی، اس نوجوان فاتح نے نہ صرف راجہ داہر کو اس کی مسلسل پیمان شکنیوں کی سزا دی بلکہ دیبل (نواح کراچی) سے لے کر ملتان تک کا علاقہ (بشمول بلوچستان) فتح کر کے اسلامی قلمرو میں شامل کر لیا۔ محمد بن قاسم کشمیر اور شمالی ہند پر اپنے حملے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے کہ دربار خلافت کی طرف سے ان کی معزولی کے فرمان نے ہندوپاک کے بقیہ خطوں کو مسلمانوں کے قدوم میمنت سے کچھ عرصے کے لئے محروم کر دیا۔

فتوحات اسلامیہ کا اگلا باب سلطان محمود غزنوی (۴۲۱ھ/ ۱۰۳۰ء) نے اپنے سترہ

حملوں کے ذریعے تصنیف کیا۔ مسلمانوں نے نہ صرف ہندو راجوں اور مہاراجوں کی فوجی قوت کا خاتمہ کیا بلکہ موجودہ پاکستان میں شامل جنوبی پنجاب و سرحد کے بیشتر علاقوں کو فتح کر کے سلطنت غزنویہ کا حصہ بنا دیا۔ سلطان محمود غزنوی کے مشن کی تکمیل سلطان شہاب الدین محمد غوری اور اس کے بہادر سپہ سالار و جانشین سلطان قطب الدین ایبک کے ہاتھوں سے ہوئی۔ جنہوں نے دہلی اور اس کے آگے تک کے علاقوں کو فتح کر کے " سلطنت دہلی " قائم کی۔ اسی زمانے میں ایبک کے جرنیل محمد بن بختیار خلجی نے عزم و جواں ہمتی کی ایک داستان تصنیف کر کے بنگال، بہار اور ہماچل پردیش وغیرہ کے دروازے مسلم افواج کے لئے کھول دیئے، جبکہ جنوبی ہند اور دکن کو سلطان علاؤالدین خلجی (م ۷۱۵ھ/۱۳۱۶ء) کے حکم پر اس کے سپہ سالار ملک کافور نے فتح کر کے اسلامی قلمرو میں شامل کیا۔ یوں چھ صدیاں پہلے کا " فتح ہند " کا مشن مجموعی طور پر اختتام کو پہنچا، گو جزوی طور پر یافت اور بازیافت کا سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر (م ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء) کی وفات تک جاری و ساری رہا

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ برعظیم پاک و ہند کی اس سرزمین کو مسلمانوں نے بڑی طویل جدوجہد اور کئی خونریز جنگوں کے بعد حاصل کیا، اس کے حصول کے لئے بلا مبالغہ ہزاروں مسلمانوں نے جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانیاں پیش کیں، اس بنا پر یہ سرزمین فتوحات اسلامیہ کی قسم ثانی ہی کے زمرے میں آتی ہے، جس پر بلاشبہ "فتح الامام بلدة عنوة ای قهرًا" (امام کا کسی علاقے کو بزور شمشیر فتح کرنے کا) عنوان ہی صادق آتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ نے اس "قسم ثانی" کے لئے کیا احکام تجویز کئے ہیں۔

کتب تاریخ مثلاً البلاذری کی فتوح البلدان، ابن الاثیر کی تاریخ الکامل، قاضی ناصر کی طبقات ناصری اور محمد بن قاسم فرشتہ کی تاریخ فرشتہ وغیرہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تمام مفتوحہ علاقوں پر مسلم فاتحین نے "خراج" ہی مقرر کیا تھا۔ اسطرح یہ تمام زمینیں "سواد عراق" (عراقی سرزمین) ہی کے طبقے میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔

" عراق " کی سرزمین، جو بعد کے مفتوحہ علاقوں کے لئے ایک نظیر اور بنیاد ثابت ہوئی " عہد فاروقی " میں فتح کی گئی۔ فتح کے بعد اس کی تقسیم پر صحابہ کرام کے درمیان اختلاف پیدا

ہو گیا۔ بعض صحابہ کرام یہ چاہتے تھے کہ اس تمام مفتوحہ علاقے کو "مجاہدین" کے مابین اسی طرح تقسیم کر دیا جائے، جس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر کی مفتوحہ زمینوں کو صحابہ کرام کے درمیان تقسیم فرمایا تھا، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد فرمایا کہ اگر تمام مفتوحہ زمینیں موجودہ مجاہدین میں تقسیم کر دی گئیں تو آئندہ دور کے مسلمانوں کی ضروریات کی کفالت کیوں کر ہو سکے گی۔ اور پھر حضرت فاروق اعظم یہ بھی مشاہدہ فرما رہے تھے کہ اگر زمینوں کی تقسیم کا یہ عمل اسی طرح جاری رہا تو ایک طرف تو صحابہ کرام کے بڑھتے ہوئے قدم زمینداری کے خار زار میں الجھ کر رہ جائیں گے اور دوسری طرف خود مسلمانوں میں بڑے بڑے زمیندار پیدا ہو جائیں گے اور یوں دولت اور وسائل کے ارتکاز کی وہ صورت حال پیدا ہو جائے گی جس سے قرآن مجید میں صراحتہً روکا گیا ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں اس اختلاف اور پھر اجماع کی روداد ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"فتح عراق کے وقت عہد فاروقی میں مسلمانوں کے درمیان (زمینوں کی تقسیم کے مسئلے پر) اختلاف پیدا ہو گیا۔ امام ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں یہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے بہت سے علماء مدینہ نے یہ بیان کیا کہ جب حضرت عمر فاروقؓ کے پاس حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کی طرف سے فتح عراق کا مژدہ لے کر وفد پہنچا تو حضرت عمر فاروق نے اراضی عراق و شام کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے حضرت عمر فاروقؓ سے کہا کہ وہ اراضی ان کا حق ہیں فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اگر ساری اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی گئی تو پھر بعد کے آنے والے مسلمانوں کا کیا ہو گا..... اگر میں عراق و شام کی تمام زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دوں تو سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا۔ نیز اولاد اور اس علاقے کے لوگوں کے لئے کیا بچے گا۔ جبکہ اہل عراق و شام حضرت عمر سے با اصرار یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ حضرت عمر اس زمین کو ایسی قوم کی کفالت کے لئے وقف کر دیں جو کہ ان جنگوں میں شامل نہیں، اور مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کے لئے، حضرت عمرؓ کی اس رائے پر مہاجرین تو متفق ہو گئے مگر انصار متفق نہ ہوئے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ۵ صحابہ اوس سے اور پانچ خزرج سے طلب کئے۔ اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ انہوں نے اس فیصلے سے اتفاق کر لیا"۔

ارض عراق کے بارے میں حضرت فاروق اعظم کے اس حکم کو امام ابو عبید القاسم بن سلام نے یوں نقل کیا ہے:

"یہ زمینیں مسلمانوں کے لئے محفوظ بطور وقف رکھی جائیں کہ نسلاً بعد نسلٍ ان کا فائدہ پہنچتا رہے۔ اور ان کے لئے اپنے دشمن کے مقابلے میں تقویت کا باعث ہوں"۔

حضرت فاروق اعظم کا یہ حکم نامہ فقہا کے مابین بھی اختلاف ونزاع کا باعث بنا' چنانچہ امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ اگر چاہے تو مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین (غانمین) میں تقسیم کر دے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خیبر کی زمینوں کو تقسیم فرمایا اور چاہے تو وہ زمین اس کے قدیم مالکوں کے قبضے میں رہنے دے اور خود کفار پر جزیہ اور زمینوں پر خراج مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت عمر فاروق نے صحابہ کرام کے اتفاق کے ساتھ "ارض عراق" کے بارے میں یہی حکم نافذ فرمایا ۔ بعض قدیم مصادر میں حنفی مسلک کے بیان کے لئے "وقف" کی اصطلاح بھی ملتی ہے۔ "جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان سے حاصل شدہ منافع تمام مسلمانوں پر تقسیم ہوں گے' امام مالک اور امام احمد بن حنبل نے بھی اس دوسری صورت کو ترجیح دی ہے' البتہ امام شافعی اسے مجاہدین میں تقسیم کرنے کی حمایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مفتوحہ زمینیں مجاہدین کی رضامندی کے بغیر وقف نہیں کی جاسکتیں ۔ لیکن بقول امام شوکانی جمہور صحابہ وتابعینؒ اور خلفائے راشدین کی آراء حنفی ومالکی مسلک کی تائید کرتی ہیں

برعظیم پاک وہند کی تمام زمینیں چونکہ بزور شمشیر فتح کی گئی ہیں اسی لئے اس پر قریب قریب تمام فقہا کا اتفاق ہے کہ یہ تمام زمینیں خراجی ہیں۔ عشری نہیں ہیں۔ اور یہ کہ خراجی زمینوں کا خراج تمام مسلمانوں کی بہبود وکفالت عامہ کی مد میں خرچ کیا جاسکتا ہے' ہندوستان کے علماء وفقہا نے خاص اس مسئلے کی تحقیق وتدقیق کے لئے بڑی بڑی کاوشیں کی ہیں۔ ہندوستان کے تمام فتاویٰ میں یہ مضمون تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ فتاویٰ کے علاوہ اس عنوان پر مستقل کتابوں کی بھی کمی نہیں۔ ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم مولانا جلال الدین تھانیسری (م ۹۸۹ھ/ ۱۵۸۱ء) نے عربی زبان میں ایک مستقل

رسالہ "تحقیق اراضی ہند" تصنیف فرمایا جو ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء میں مطبع احمدی میں طبع ہو چکا ہے اور اس کے قلمی نسخے جامعہ پنجاب لائبریری سمیت مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اس وقیع علمی رسالے میں شیخ جلال الدین تھانیسری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیشتر زمینیں ان لوگوں کی ملک نہیں ہیں جن پر وہ قابض ہیں بلکہ ان میں سے اکثر زمینیں سرکاری خزانے کی مملوکہ ہیں اور حکومت اسلامیہ مفاد عامہ کے لئے ان میں جائز تصرف کرنے کی مجاز ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

"پس نتیجہ یہ نکلا کہ امام ابو حنیفہ کے قول پر ہندوستان کی اکثر و بیشتر اراضی ان لوگوں کی ملکیت نہیں ہیں جو ان پر قابض ہیں۔ سوچو اور سمجھو پھر معلوم رہے کہ جب ہندوستان کی اراضی ان انواع مختلفہ پر قائم ہیں جن کا گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے تو اراضی ہند کے متعلق کسی شخص کی ملکیت و عدم ملکیت پر حکم لگانا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک یقین کے ساتھ یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ذکر کردہ انواع میں سے کس نوع میں شامل ہے"۔

شیخ جلال الدین تھانیسری کے یہ فقہی ارشادات اس زمانہ سے متعلق ہیں جب ہندوستان پر مسلم حکومت کا آفتاب عین نصف النہار پر تھا۔ اور ہندوستان کے طول و عرض میں مغل اعظم کے اقتدار کی بساط بچھی ہوئی تھی جبکہ متاخر مغلیہ عہد کے مشہور و معروف محقق قاضی محمد اعلیٰ التھانوی (م ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء) مؤلف کشاف اصطلاحات الفنون نے بھی خاص اسی موضوع پر ایک رسالہ تصنیف فرمایا، جو تاہنوز زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہو سکا۔ اس رسالے میں قاضی التھانوی نے شیخ جلال کے مسلک کی تائید کی، اور اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری اس کی بابت فرماتے ہیں:

"مولانا محمد اعلیٰ تھانوی نے اپنے رسالے میں ذکر کیا ہے کہ اراضی ہند نہ عشری ہیں اور نہ خراجی بلکہ اراضی حوزہ یعنی سرکاری بیت المال کی ملکیت ہیں، کسی کی شخصی ملکیت نہیں"۔

قاضی محمد اعلیٰ تھانوی قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی کے ہم عصر ہیں۔ مگر معاصرت کے باوجود دونوں کی آراء میں ہمیں معمولی سا اختلاف نظر آتا ہے۔ جس کی تفصیل سطور ذیل میں پیش کی

جائے گی۔

قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی نے اس عنوان پر گو مستقل رسالہ یا کتاب تو تصنیف نہیں کی تاہم انہوں نے اس کے متعلق فتاویٰ ضرور تحریر کئے ہیں جن میں سے دو فتاویٰ دستیاب ہیں جن میں اس موضوع پر مفصل اظہار خیال کیا گیا ہے۔

قاضی صاحب کے ان فتووں کا شان ورود یہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کی طرف سے مختلف امراء اور خاندانوں کو "مدد معاش" کے لئے جو زمینیں دی جاتی تھیں قاضی صاحب کے زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا یہ زمینیں ان لوگوں کی شرعی ملکیت ہیں یا یہ ملکیت محض عارضی اور وقتی نوعیت کی ہے۔ اس مسئلے میں کاندھلہ کے ایک مشہور عالم دین مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (۱۲۴۵ھ / ۱۷۲۹ء) کے پاس قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کا فتویٰ موجود تھا۔ اس فتوے پر اظہار خیال اور تبصرہ کے لئے مفتی صاحب نے اسے قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی کی خدمت میں ارسال کیا' ٹھیک طور پر تو معلوم نہ ہو سکا کہ قاضی محمد اعلیٰ تھانوی کے فتویٰ کی اصل عبارت کیا تھی۔ لیکن قاضی محمد ثناءاللہ پانی پتی کی عبارت کے بین السطور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں چند اختلافی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ قاضی صاحب اس فتوے پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"بعد سلام مسنون کے بعد واضح ہو کہ آپ کا پہلا خط مع استفتاء ملا تھا' اس کے ساتھ قاضی محمد اعلیٰ کی مہر لگا ہوا وہ حکم نامہ بھی تھا جو مدد معاش کے بارے میں بادشاہ کے دستور العمل کی مطابقت پر قاضی کے حکم کے بارہ میں تھا..... اس بارے میں فتویٰ تحریر کیا جاتا ہے۔

"سواد عراق کی زمینوں کی طرح ہندوستان کی زمینیں بھی نہ مسلمان بادشاہوں کی ملکیت ہیں اور نہ مسلمانوں کی بلکہ ان کے مالک زمین والے ہی ہوں گے' خواہ کافر کیوں نہ ہوں' صاحب ہدایہ فرماتے ہیں سواد کی زمین زمین والوں کی ہو گی' ان لوگوں کو اسے بیچنے اور اسمیں تصرف کرنے کا حق حاصل رہے گا۔ کیوں کہ امام جب کسی زمین کو زبردستی فتح کرے تو وہ اس پر زمین والے کے قبضے کو برقرار رکھے گا اور اس پر خراج عائد کرے گا۔ اسطرح زمین (پہلے کی طرح) اپنے مالک کی ملکیت اور تصرف میں رہے گی"۔

زمین پر خراج ایک اسلامی حق ہے' بادشاہ اس کو لینے اور اس کے مصرف میں خرچ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اگر وہ بیجا مصرف میں خرچ کرے گا تو وہ گنہ گار ہو گا قاضی صاحب کا یہ زمانہ ایک عبوری دور سمجھا جا سکتا ہے جس میں ملکی اور قومی سطح پر تبدیلیوں کا عمل بڑی تیزی کے ساتھ جاری تھا۔ مغل انتظامیہ کمزور سے کمزور ہو رہی تھی اور دوسری جانب مختلف صوبوں کے گورنر اپنی اپنی جگہ خود مختار ہو رہے تھے۔ اگر مزید گہرائی میں جا کر سوچا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ برعظیم پاک و ہند میں بڑی بڑی جاگیروں اور جائیدادوں کے قیام و استحکام کا یہی زمانہ تھا۔ لہٰذا اسے وقت کا اہم ترین مسئلہ یعنی BURNING QUESTION بھی کہا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے اس فتوے میں اسی صورت حال کو پیش نظر رکھا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ فتویٰ مفصّل ہے اسمیں حسب ذیل امور پر روشنی ڈالی گئی ہے:

۱..... اگر بنجر زمین کا کوئی قطعہ بادشاہ اسلام کسی شخص کو عطا کر دے اور وہ اس بنجر زمین کو آباد کر لے تو وہ اس کا جائز مالک ہو گا اور حکومت وقت اس سے عشر یا خراج وصول کر کے اس کے جائز مصرف میں خرچ کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔

۲..... اگر زمین سرکاری بیت المال کی ہے جسے "ارض حوزہ" کہا جاتا ہے اور بادشاہ وقت اس میں سے کسی شخص کو کوئی قطعہ مرحمت کر دے تو وہ اس کا شرعی مالک متصوّر ہو گا۔

۳..... ان دو اقسام کے علاوہ قاضی صاحب کے نزدیک ہندو پاک کی بیشتر اراضی "خراجیہ" ہے یعنی نہ وہ بادشاہ اسلام کی ملکیت ہے اور نہ مسلمانوں کی' بلکہ وہ اراضی اصل قدیمی باشندوں کی ملکیت ہے۔ اسلامی حکومت ان کا خراج وصول کرنے اور اسے کفالت عامہ کی مد میں صرف کرنے کی مجاز ہو گی۔

۴..... اگر وہ اراضی مقامی کسانوں کی ملکیت ہو اور بادشاہ وقت نے کسی شخص کو محض اس زمین کا محصول (لگان) وصول کرنے کا حق دیدیا ہو تو ایسی صورت میں وہ شخص متعلقہ زمین کا مالک نہ ہو گا۔ بلکہ محض اس کے محصول کو وصول کرنے کا حقدار ہو گا۔

۵..... اسی طرح اگر بادشاہ "مدد معاش" کے لئے کسی شخص کو مزروعہ زمین کا خراج وصول کرنے کے اختیارات سونپ دے جیسا کہ ہندوستان کے عام بادشاہوں کا دستور ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص محض خراج وصول کرنے کا اہل ہو گا وہ نہ اس خراج کو بیچ سکتا ہے اور

نہ کسی کو بطور عطیہ اور ھبہ کے عطا کر سکتا ہے۔ فتاوی احمدیہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ :

"جن زمینوں کو امام استحقاق کے طور پر کسی شخص کو دیتا ہے تو یہ شخص ان زمینوں کا مالک نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے نہ انکو بیچا جا سکتا ہے اور نہ ھبہ کیا جائے گا۔ اور نہ انہیں وراثت چلے گی بلکہ عطا کئے جانے والے شخص کی وفات کے بعد خراج بیت المال میں داخل کر لیا جائے گا"۔

۶..... قاضی محمد اعلیٰ التھانوی کے نزدیک پرانے بادشاہوں کا دستور العمل ان کے بعد بھی جاری رکھا جا سکتا ہے اور اس ضمن میں قاضی کے فیصلے کو "حکم حاکم" ہی کی حیثیت حاصل ہوگی مگر قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو قاضی محمد اعلیٰ کی اس رائے سے اتفاق نہیں 'ان کے خیال میں "مدد معاش" کے تحت دی جانے والی زمینوں کے بارے میں بادشاہ کی زندگی تک ہی محدود رہے گا۔ اس کی وفات کے بعد اسے جاری نہیں رکھا جا سکتا' جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر بادشاہ سابق نے کسی شخص کو خراجی زمینوں میں سے کوئی جاگیر دی ہو تو وہ چونکہ ملک کی زمینوں کا مالک نہیں ہے بلکہ منتظم ہے لہٰذا ملکی اراضی کسی خاندان کی مستقل ملکیت میں دینا اس کے اختیارات سے تجاوز ہے اور اس عطئے پر نظر ثانی کا حق مملکت کو بہرحال رہتا ہے۔

یہاں شیخ جلال الدین تھانیسری اور قاضی صاحب کے نقطہ نگاہ کا فرق محسوس کیا جا سکتا ہے شیخ جلال الدین کے نزدیک اگر بادشاہ وقت خراجی زمین کسی کو بطور جاگیر عطا کر دے تو وہ سابقہ مالکان کی ملک سے خارج ہو کر اس کی ملک میں داخل ہو جائے گی۔ مگر قاضی صاحب کے نزدیک بادشاہ وقت کو اس قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں' ہندوپاک کی اراضی مملکت کی اراضی ہیں بادشاہ زیادہ سے زیادہ کسی کو مدد معاش کے لئے اس کا لگان وصول کرنے کا اختیار دے سکتا ہے اور وہ بھی عارضی اور محدود مدت کے لئے۔یوں اراضی "ہندوپاک" اصل مالکان کی ملک میں رہتے ہوئے مملکت یعنی سٹیٹ کی ملکیت ہوں گی۔

قاضی محمد اعلیٰ التھانوی کا یہ بھی خیال تھا کہ صدر الصدور کو یا قاضی شہر کو بحیثیت نائب سلطان جاگیروں کو بحال رکھنے یا منسوخ کرنے کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مگر قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی اس نکتے سے اختلاف کرتے ہیں اور واضح فرماتے ہیں کہ قاضی کو

محض حکم شرعی کے مطابق یا "بادشاہ حال" کے دستور العمل کے مطابق ہی فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کا نہیں' قاضی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن یہ واضح رہے کہ یہ حکم موجودہ بادشاہ سے متعلق ہے کیوں کہ اگر بادشاہ کا انتقال ہو جائے یا وہ معزول کر دیا جائے تو اس کا حکم معتبر نہ ہو گا۔ خلاصہ کلام یہ کہ بادشاہ اپنی سلطنت کے تمام شہروں میں نہیں پہنچ سکتے تھے اس لئے وہ صدور کو مقرر کرتے اور اپنا دستور العمل تحریر کرتے تھے' اسی کے مطابق انعام پانے والے کے ورثہ معاشی مدد کے لئے دی جانے والی زمینوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ یہ دستور العمل بادشاہ کی زندگی تک جاری و معتبر سمجھا جاتا ہے۔ صدور اسی پر عمل کرتے ہیں اور قضاہ بھی صدور کے حکم کو جاری کرتے ہیں کیوں کہ وہ بادشاہ کے نائب ہوتے ہیں لیکن بادشاہ کی موت کے بعد وہ دستور العمل معتبر نہیں رہ جاتا۔"

انگریزوں کی عطا کردہ اراضی کا حکم

قاضی صاحب نے مذکورہ دونوں فتاوی ۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء میں تحریر فرمائے اس وقت دھلی اور پانی پت پر ابھی انگریز حکومت کی عملداری قائم نہ ہوئی تھی' انگریزوں نے دھلی اور تمام دوآبہ پر لارڈ لیک کی قیادت میں ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں قبضہ کیا اسی لئے ان فتاوٰی میں برطانوی استعمار کی عطا کردہ اراضی کا مسئلہ زیر بحث نہیں لایا جا سکا اور نہ ہی قبل از وقت ایسا ممکن تھا' تاہم قاضی صاحب نے بطور اصول اور ضابطے کے چند ایسے نکات بیان کئے ہیں کہ جن سے اس اہم مسئلے میں بھی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان میں سے ایک اصول تو یہ ہے کہ کسی بھی بادشاہ وقت کو مملکت اسلامیہ کا کوئی بھی قطعہ اراضی (باستثنائے چند) کسی کی مستقل ملکیت میں دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ مدد معاش کے طور پر کسی علاقے کا خراج وصول کرنے کا اختیار کسی کو تفویض کر سکتا ہے۔ مگر یہ اختیار بھی خالصتاً عارضی بنیادوں پر اسے حاصل رہے گا۔ جبکہ دوسرا اصول یہ ہے کہ "مدد معاش" کی آگے منتقلی محض بادشاہ وقت کے دستور العمل کے مطابق ہو سکتی ہے۔ اب آیئے ہم دیکھیں کہ برطانوی استعمار نے برعظیم پاک و ہند کی یہ سرزمین کس طرح حاصل کی اس سلسلے میں محتاط سے محتاط بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ انگریزوں نے جنگ بکسر (۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء) کے ایک سال بعد مغل

بادشاہ شاہ عالم سے بنگال کے حقوق دیوانی دو لاکھ روپے میں حاصل کر لئے تھے۔ اور بعد ازاں وہ مکروفریب کی سیاست کے ذریعے مغلیہ حکومت کے وکیل مطلق بنے' اور پھر انہوں نے بادشاہ ہند کو اپنا وظیفہ خوار بنالیا۔ اس طرح ہندوستان پر انگریز راج دھوکے اور شاطرانہ چالبازی کے بل بوتے پر قائم ہوا۔ ایسی صورت میں اس کو کسی قسم کی شرعی اور قانونی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تمام علماء وفقہا نے انگریز حکومت کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کیا اور انگریز حکومت کے دو صدیوں پر محیط دور حکومت میں ہمیشہ مسلمانوں نے اس کے خلاف علم جہاد بلند رکھا۔ اس پس منظر میں انگریز حکومت کی جانب سے جن لوگوں کو ابنائے وطن سے غداری کے نتیجے میں سینکڑوں کے حساب سے مربع الاٹ کئے گئے گو مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم ومغفور نے ان کے جائز ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ مگر قاضی صاحب کے مذکورہ بالا اصولوں کے تحت اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ تاہم قانون رواج کے تحت ان کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے ہندو پاک کی اراضی کے بارے میں جو نقطہ نظر پیش کیا۔ سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدّث دھلوی (م ۱۲۳۹ھ/ ۱۷۲۴ء) اور شاہ اسماعیل شہید (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کے فتاویٰ بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

اختتام

اسلامی معاشی نظام محض "سود" کا نام بدل دینے یا ہر سہ ماہی کے بعد سو دو سو روپیہ فی خاندان زکوٰۃ تقسیم کرنے سے نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بجائے اسلامی معاشیات کی منزل مراد کفالت عامہ کا تصور ہے جسے قرآن مجید نے وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ یعنی لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں کہہ دو جو ضرورت سے زیادہ ہو اور وَ فِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ یعنی اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا ہے وغیرہ کی آیات طیبہ کے ذریعے سے پیش کیا "کفالت عامہ" سے مراد یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے ہر شہری کو رہنے کے لئے مکان' کھانے کے لئے روٹی اور پہننے کے لئے موسم کے مطابق لباس ملنا چاہئے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ روٹی کپڑے اور مکان کا یہ نعرہ سوشلزم نے دیا حالانکہ یہ پروگرام سب

سے پہلے اسلام نے پیش کیا تھا۔ علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء) اپنی کتاب المحلی میں تحریر فرماتے ہیں:

فرض علی الاغنیاء من اھل کل بلد ان یقوموا بفقرائھم ویجبر ھم السلطان علی ذالک ان لم تقم الزکوات بھم ولا فی سائر اموال المسلمین بھم فیقام لھم بما یاکلون من القوت الذی لا بدمنہ و من اللباس للشتاء والصیف بمثل ذالک وبمسکن یکنھم من المطر والصیف والشمس وعیون الماره

ہر شہر کے مالداروں پر یہ فرض ہے کہ اپنے شہر کے فقراء کی ضرورتوں کو پورا کریں اگر زکواۃ اور مسلمانوں کے دیگر ذرائع سے ان کی ضرورتیں پوری نہ ہوں تو بادشاہ ان کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ ہر آدمی کو ضرورت کے مطابق خوراک، سردی گرمی کے مطابق لباس اور بارش اور گرمی سردی سے بچنے کے لئے مکان مہیا کریں۔

اگر کسی وقت صحیح اقتصادی نظام قائم ہوا اور اس نے "مملکت پاکستان" کے تمام باشندوں کی کفالت عامہ کے پروگرام کو اپنا مشن بنایا تو اس کے لئے قاضی صاحب کے ان مذکورہ فتاویٰ میں بھرپور رہنمائی موجود ہے۔

♠♠

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(۱۳)

حکمتِ اقبال

خودی اور نصب العین کا باہمی تعلق

اقبال نے خودی اور اس کے نصب العین کے باہمی تعلق کا ذکر اس طرح سے کیا ہے کہ گویا خودی نصب العین کی محبّت ہے اور نصب العین کی محبّت خودی ہے۔ نصب العین کو اقبال کبھی مدعا کبھی مقصد، کبھی مقصود، کبھی آرزو اور کبھی تمنا کا نام دیتا ہے۔ خودی کی بقا کا دارومدار نصب العین کی محبّت پر ہے اس لیے کہ خودی کی زندگی خودی کی حرکت کا ہی دوسرا نام ہے۔ اگر وہ حرکت نہ کرے تو مردہ ہے دریا کی ایک لہر کی طرح کہ جب تک وہ چلتی رہے لہر ہے، تھم جائے تو کچھ بھی نہیں۔

ساحلِ افتادۂ گفت بے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موج از خود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر بروم گر نروم نیستم

زندگی یا خودی فقط حرکت یا دوڑ یا ذوقِ پرواز یا ذوقِ سفر ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

لیکن خودی کا سفر ہمیشہ اُس کے نصب العین کی سمت میں ہوتا ہے لیکن یہ سفر صحیح نصب العین کی سمت میں ہونا چاہیے جو خدا ہے۔ اِسی لیے قرآن کا ارشاد ہے۔ فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہِ (یعنی جب کسی نصب العین کی طرف دوڑنا تمہاری فطرت ہے) تو خدا کی طرف دوڑو (جو سچّا نصب العین ہے) خودی کی حرکت یا دوڑ یا پرواز یا اس کا سفر نصب العین کی محبّت کے بغیر ممکن نہیں۔ نصب العین کی محبّت ہی خودی کو حرکت پر اکساتی ہے۔ اس کی حرکت کی سمت کو معین کرتی ہے اور اس کے کارواں کے لیے درا کا کام دیتی ہے۔

زندگانی را بقا از مدعاست
کارِ دانش را درا از مدعاست

یہ کہنا کہ زندگی یا خودی یا حیات ذوقِ سفر کے سوائے کچھ اور نہیں دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ زندگی یا خودی یا حیات فقط نصب العین کی محبّت ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ خودی کے تمام افعال و اعمال اس کے نصب العین کے حصُول کے لیے سرزد ہوتے ہیں۔ خودی اپنے آپ کو کلیتہً نصب العین کے تابع کر دیتی ہے اور اُسی کو نیک و بد، خوب و زشت اور حق و باطل کا معیار بناتی ہے اور لہٰذا ہر فعل اور عمل کو اُسی کی وجہ سے قبول کرتی یا رد کرتی ہے۔ نصب العین ہمارے عمل کی جان ہے اور جان ہی کی طرح ہمارے عمل کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے یہ ہمارا نصب العین ہی ہے جو ہمارے ہر عمل کا کیف و کم معیّن کرتا ہے۔

چوں حیات از مقصدے محرم شود — ضابطِ اسبابِ ایں عالم شود
خویشتن را تابعِ مقصد کند — بہر او چیند، گزیند، رد کند
ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل، — کیف و کم از وے پذیرد ہر عمل

نصب العین ہی اعمالِ انسانی کی قوّتِ محرکہ ہے

نصب العین ہی وہ قوت ہے جو خودی کے عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ اس کی حرکت کو تیز کرتی ہے۔ اسی کی ایڑ سے خودی کے عمل کا گھوڑا بادصرصر کی طرح چلنے لگتا ہے۔ زندگی کی قوتیں سیماب کی طرح ہیں اگر ان کی کوئی سمت معیّن نہ ہو تو وہ کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف لڑھک جاتی ہیں۔ نصب العین ان قوتوں کے بہاؤ کی سمت متعین کرتا ہے۔ لہٰذا ان سب کو ایک مرکز پر لاکر مجتمع اور متحد اور منظّم کر دیتا ہے۔ نصب العین فرد کی زندگی کا ایک ایسا مرکز ہے جس کی طرف اُس کی تمام قوتیں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نصب العین کی محبّت ہی خودی کے لیے ممکن بناتی ہے کہ اس دنیا کے تمام اسباب و ذرائع کو اپنے کام میں لائے کیونکہ نصب العین ہی ان کے استعمال کی ضرورت محسوس کراتا ہے اگر ہماری رگوں میں خون بڑی تیزی سے گردش کر رہا ہو یعنی اگر ہم اپنی پُوری قوت سے سرگرم عمل ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ کسی نصب العین کی شدّت محبت ہی ہمیں ایسا کرنے پر اُکسا رہی ہے۔ نصب العین کی محبّت کے بغیر ہم اپنی کسی اندرونی یا بیرونی قوّت کو استعمال نہیں کر سکتے کیونکہ اس کا کوئی مصرف ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا لہٰذا ہماری ہمت بیکار ہو کر رہ جاتی ہے نصب العین ایک ایسی قوّت ہے جس کے اثر سے ایک پُوری قوم کے ہاتھ پاؤں متحرک ہو جاتے ہیں اور سینکڑوں نگاہیں بیک وقت اپنا زاویہ بدل لیتی ہیں گویا یہی وہ قوّت ہے جو ایک قوم کے تمام افراد کو آپس میں متحد و منظم کر کے ایک قوم بناتی ہے۔ نصب العین ہی خودی کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا سبب ہے۔ وہی اس کے خاموش اور پُر سکون سمندر میں طلاطم پیدا کرتا ہے۔ اب اقبال کے الفاظ میں سُنیئے۔

مدّعا گردد اگر مہمیز ما	ہمچو صرصر مے رود شبدیز ما
مدّعا رازِ بقائے زندگی	جمعِ سیمابِ قوائے زندگی
گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست	تیز از سعیِ حصولِ مدعا ست
مدّعا مضرابِ سازِ ہمت است	مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است
دست و پائے قوم را جنباند او	یک نظر صد چشم را گرداند او
آرزو ہنگامہ آرائے خودی	موج بیتابے ز دریائے خودی

ہمارے تمام چھوٹے چھوٹے مقاصد نصب العین کے ذیلی اور ضمنی مقاصد ہوتے ہیں جو اس کے ماتحت اس کی اعانت کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کو نصب العین کی محبت اور کشش ہی کی وجہ سے اہمیت دیتے اور حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نصب العین کی محبت ہمارے تمام اعمال کی قوت محرکہ ہے۔ وہی ان کو پیدا کرکے ان کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔

آرزو صید مقاصد را کمند
دفتر اعمال را شیرازہ بند

نصب العین کی محبت ہی وہ پُراسرار انسانی خواہش ہے جو انسانی شخصیت کا گاڑی کے کوچوان کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شخصیتِ انسانی کی اس پُراسرار مرکزی اور حکمران خواہش کے متعلق صرف یہ معلوم کر لینا کہ وہ کسی نصب العین کی خواہش ہوتی ہے کافی نہیں جب تک یہ معلوم نہ کیا جائے کہ وہ کون سے نصب العین کی خواہش ہے۔ کیونکہ نصب العین سینکڑوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے بعض مختلف درجوں پر اچھے اور بلند بھی ہو سکتے ہیں اور بعض بُرے اور پست بھی۔ ان میں سے کون سا نصب العین ہے جو درحقیقت اس خواہش کا مقصود ہے اور لہٰذا صحیح اور سچا نصب العین ہے۔ چونکہ نصب العین حسن و کمال کا ایک تصور ہوتا ہے اور نصب العین کی خواہش حسن کی خواہش کا دوسرا نام ہے لہٰذا ایک بات بالکل واضح ہے کہ یہ خواہش ایک ایسے نصب العین کے لیے ہے جو منتہائے حسن و کمال ہو یعنی جس کے اندر وہ تمام صفاتِ حسن بدرجہ کمال موجود ہوں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ جو ان تمام نقائص سے کلیتہً پاک ہو جو ہمارے ذہن میں آ سکتے ہیں۔ حسن میں کمال کی خواہش اس لیے شامل ہے کہ جو چیز ناقص ہو وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ نقص حسن کا نقیض ہے لہٰذا محبت کا دشمن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بسا اوقات ہم ایک ناقص تصور سے بھی محبت کرتے ہیں لیکن یہ اسی وقت تک ممکن ہوتا ہے جب تک کہ اس کا نقص ہماری نظروں سے اوجھل رہے۔ جوں ہی کہ ہم اس کے کسی نقص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی محبت کو پھر کسی درجہ میں بھی قائم رکھ سکیں۔ اقبال کہتا ہے کہ ہمارا نصب العین ایسا ہونا چاہیے جس کا حسن مکمل طور پر دلربا ہو، جس کے حسن کا احساس یا عشق یہاں تک ترقی کر سکے کہ اس کی شدت اور گہرائی کے اندر کوئی کمی یا

کسر باقی نہ رہے، یہاں تک کہ انسان کی خودی اس کے عشق کی شراب سے مست اور مخمور ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک یہ نکتہ اس قدر اہم ہے کہ اسے جان لینا گویا زندگی کے راز سے واقف ہو جانا ہے اور اُسے نہ جاننا رازِ زندگی سے بیگانگی ہے۔

اے زرازِ زندگی بیگانہ خیز — از شرابِ مقصدے مستانہ خیز
مقصدے از آسمان بالاترے — دلربائے دلستانے دلبرے

کامل نصب العین کی صفات: غیر محدود اور لازوال حُسن

انسان کے نصب العین کی ان عمومی اور مجمل صفات کی روشنی میں ہم اس کی مخصوص اور مفصل صفات بآسانی معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ضروری ہے کہ انسان کے نصب العین کا حسن غیر محدود اور لازوال ہو کیونکہ اگر ایک انسان یہ سمجھتا ہو کہ اس کے نصب العین کے حسن و کمال کی ایک حد ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تو وہ سمجھے گا کہ اس کا ایک حصّہ یا ایک پہلو حسن اور زیبائی کے اوصاف سے محروم ہے اور جہاں اس کا حسن ختم ہوتا ہے وہیں سے یہ محرومی شروع ہو جاتی ہے اور پھر اگر وہ یہ جانتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کے نصب العین کا حسن ختم ہو جائے گا تو وہ یہ سمجھے گا کہ وہ اب بھی حسین نہیں کیونکہ اس کے حسن کو ختم کرنے والا کل کا دن آج بھی آنے والے دنوں میں شمار ہو رہا ہے۔

ازلی اور ابدی زندگی

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا نصب العین زندہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی انسان جان بوجھ کر کسی ایسی چیز کے تصوّر کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتا جو اس کے نزدیک مردہ اور بے جان ہو وہ خود زندہ ہے لہٰذا کسی ایسی چیز کے لیے جو مردہ ہونے کی وجہ سے اس سے پست تر درجہ کی ہو وہ محبت کا جذبہ محسوس نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی ستائش کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی خدمت کے لیے طرح طرح کی قربانیاں کرنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حسن کی طرح اس کی زندگی غیر فانی ہو۔ کیونکہ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اس کا نصب العین

کل کو اپنی زندگی سے محروم ہونے والا ہے تو وہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگا کہ وہ آج بھی دائمی زندگی سے محروم ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر زندگی کے وہ تمام اوصاف جن سے وہ آشنا ہے موجود ہوں مثلاً یہ کہ وہ سُنے، دیکھے، سمجھے، محسوس کرے اور اس کی محبت کا جواب محبت سے دے۔

محبّت اور عدم محبّت کے جذبات

انسانی دنیا میں اس کا کوئی مقصد یا مدعا ہو اور اسے اس بات کی قدرت حاصل ہو کہ وہ حصولِ مدعا کے لیے عمل کرے اور اپنے عمل کو کامیاب بنائے۔ دوسرے الفاظ میں اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ بعض اعمال کو پسند کرلے اور بعض کو ناپسند اور جن اعمال کو پسند کرتا ہو ان کی اعانت اور امداد کرے اور جن کو ناپسند کرتا ہو ان کی مخالفت کرے اور بالآخر روک دے، اپنے مددگاروں اور چاہنے والوں کی حوصلہ افزائی کر سکے اور مخالفوں اور دشمنوں کو سزا دے سکے۔ مختصر یہ کہ ضروری ہے کہ اس میں محبت اور عدم محبت کے تمام جذبات موجود ہوں اور وہ اپنے مدعا کی پیش برد کے لیے ان کا اظہار کرے۔ اگر کسی انسان کے نصب العین میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں یا ان میں سے کوئی ایک صفت بھی موجود نہ ہو اور وہ اس بات سے آگاہ ہو جائے تو اس کے لیے اس نصب العین سے محبت کرنا اس کی ستائش کرنا یا اس کی خدمت یا اعانت کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

محبّت کرنے والے سے عمل کا مُطالبہ

محبت ہمیشہ محبوب کی خاطر عمل کا تقاضا کرتی ہے اور اس عمل کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ محبوب کی خوشنودی حاصل کی جائے اور وہ رضامند اور مہربان ہو اور وہ چاہنے والے سے قریب آجائے کوئی نصب العین رکھنے یا کسی نصب العین سے محبت کرنے کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ عمل کے ذریعہ سے اس کی جستجو کی جائے اس کی خدمت اور اعانت کی جائے اور اس طرح سے اس کا قرب ڈھونڈا جائے۔ لیکن اگر ایک نصب العین جس سے انسان محبت کرتا ہے نہ کوئی عمل پسند کرتا ہے اور نہ ناپسند کرتا ہے نہ اس کے نزدیک کوئی بات اچھی ہے اور نہ بُری، دوسرے الفاظ

ہیں۔ اگر وہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کے نصب العین کے اندر ان میں سے بعض صفات موجود نہیں یا موجود تو ہیں لیکن بدرجۂ کمال موجود نہیں تو وہ اس کو ایک نقص تصوّر کرے گا اور اس سے محبّت ترک کر دے گا۔

بے مثلی اور بے چگونی

پھر اس کے نصب العین کو اپنی صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونا چاہیے کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی اور تصوّر ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات اسی درجۂ کمال میں موجود ہیں تو وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت کرنے کے لیے مجبور ہوگا اور ایسا کرنا اس کی فطرت کے قوانین کی وجہ سے اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ کوئی شخص بیک وقت دو نصب العینوں سے محبّت نہیں کر سکتا اور حُسن کی صفات بھی ایسی ہیں کہ وہ ایک سے زیادہ نصب العینوں میں موجود نہیں ہو سکتیں۔

خالقیّت

آخر کار یہ بھی ضروری ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے نصب العین کے مدّعا کے ماتحت اور اس کی خدمت اور اعانت کے لیے ہو۔ اوّلیہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران نہ ہو اور ان تمام صفات کا مالک نہ ہو جو اُن دو صفتوں کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ قوانینِ قدرت جو کائنات کی مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں اس وجود کی تخلیق نہ ہوں گے جو اُس کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدّعا کے ساتھ متصادم ہوں گے اور وہ اور اس کا نصب العین اس قابل نہ ہوں گے کہ اس مدّعا کو حاصل کر سکیں۔ اور پھر اگر وہ جانتا ہو کہ کائنات جس میں اس کا اپنا وجود بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور اس کے نصب العین کی حکمرانی کے دائرہ سے باہر ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین اس سے پست تر درجہ کا زیادہ سے زیادہ اس سے مساوی درجہ کا کوئی وجود ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے یا اس کی خدمت و اعانت کرنے یا اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کوئی جذبہ اپنے

میں انسانی دنیا میں اس کا کوئی مدعا ایسا نہیں جس کے حصول کے لیے وہ متمنی ہو تو اس کا چاہنے والا کیونکر جان سکتا ہے کہ اس کی خدمت اور اعانت کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ انسان اپنے نصب العین کی اعانت کے لیے عمل کرنا چاہتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ عمل کیا ہو۔ وہ ایسی محبت سے مطمئن نہیں ہو سکتا جو اس سے کسی عمل کا مطالبہ نہ کرے اور جو خود عمل کی صورت اختیار نہ کر سکے۔ اگر وہ یہ جانتا ہو کہ اس کا نصب العین نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ جانتا ہے نہ محسوس کرتا ہے نہ اس کی محبت کا جواب دے سکتا ہے نہ اس کی قدر دانی کر سکتا ہے تو وہ اپنے کسی عمل سے کوئی تسلی نہیں پا سکتا اور اس کے دل میں اپنے عمل کو جاری رکھنے کے لیے کوئی جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ جسے ہم نیکی کہتے ہیں وہ انگریزی کی مشہور مثل کے باوجود کبھی آپ اپنا انعام نہیں ہوتی بلکہ آخر کار یہ دلنواز یقین ہمیشہ اس کا انعام ہوتا ہے کہ وہ اس کے نصب العین کے نزدیک جسے وہ ایک شخصیت سمجھتا ہے پسندیدہ ہے۔

قوّت اور قدرت

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ایک انسان کا نصب العین پوری طرح سے طاقتور اور قوی ہو کیونکہ اگر وہ سمجھے کہ اس کا نصب العین اتنی قوت نہیں رکھتا کہ اپنے مددگاروں کو جو اس کے مدعا کی پیش برد کے لیے کام کرتے ہیں نوازے یا اپنے دشمنوں کو جو اس کے مدعا کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں سزا دے تو وہ محسوس کرنے لگے گا کہ ایسے نصب العین کی محبت یا اعانت ایک بے سود مشغلہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب بھی وہ دنیا کو اپنے نصب العین کے تقاضوں کے مطابق بدلنے کی پوری سعی کرے گا اس کے دشمن اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیں گے اور جو کچھ اس نے بنایا ہے آسانی سے بگاڑ دیں گے۔ لہٰذا وہ سمجھے گا کہ اس کا نصب العین کمزور اور ناتواں ہے اور اس کی محبّت یا اعانت کا حقدار نہیں۔

نیکی

پھر ضروری ہے کہ اس کے نصب العین کے اندر نیکی کی تمام صفات بدرجۂ کمال موجود ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صفات حسن کی صفات ہیں کیونکہ ہم انہیں چاہتے اور پسند کرتے

ہیں۔ اگر وہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کے نصب العین کے اندر ان میں سے بعض صفات موجود نہیں یا موجود تو ہیں لیکن بدرجۂ کمال موجود نہیں تو وہ اس کو ایک نقص تصور کرے گا اور اس سے محبت ترک کر دے گا۔

بے مثلی اور بے چگونی

پھر اس کے نصب العین کو اپنی صفات میں بے مثل اور بے نظیر ہونا چاہیے کیونکہ اگر اُسے معلوم ہو کہ دنیا میں کوئی اور تصور ایسا ہے جس کے اندر یہ صفات اسی درجۂ کمال میں موجود ہیں تو وہ بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہو گا اور ایسا کرنا اس کی فطرت کے قوانین کی وجہ سے اس کے لیے ناممکن ہو گا۔ کوئی شخص بیک وقت دو نصب العینوں سے محبت نہیں کر سکتا اور حُسن کی صفات بھی ایسی ہیں کہ وہ ایک سے زیادہ نصب العینوں میں موجود نہیں ہو سکتیں۔

خالقیّت

آخر کار یہ بھی ضروری ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق اس کے نصب العین کے مدعا کے ماتحت اور اس کی خدمت اور اعانت کے لیے ہو۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس کا نصب العین خود کائنات کا خالق اور حکمران نہ ہو اور ان تمام صفات کا مالک نہ ہو جو اُن دو صفتوں کے اندر مضمر ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ قوانینِ قدرت جو کائنات کی مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطح پر کام کر رہے ہیں اس وجود کی تخلیق نہ ہوں گے جو اُس کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اُس کے اور اس کے نصب العین کے مشترک مدّعا کے ساتھ متصادم ہوں گے اور وہ اور اس کا نصب العین اس قابل نہ ہوں گے کہ اس مدّعا کو حاصل کر سکیں۔ اور پھر اگر وہ جانتا ہو کہ کائنات جس میں اس کا اپنا وجود بھی شامل ہے خود بخود وجود میں آگئی ہے اور اس کے نصب العین کی حکمرانی کے دائرہ سے باہر ہے تو وہ محسوس کرے گا کہ اس کا نصب العین اس سے پست تر درجہ کا زیادہ سے زیادہ اس سے مساوی درجہ کا کوئی وجود ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے یا اس کی خدمت و اعانت کرنے یا اس کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے کا کوئی جذبہ اپنے

دل کے اندر محسوس نہیں کرے گا۔

یہ وہ صفات ہیں جو قرآن حکیم نے خدا کی صفات بتائی ہیں، یہی سبب ہے کہ اقبال رُومی کی زبان میں ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کو دیکھنے کی ایک آرزُو ہے۔

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است

خُودی کی فطرت سے باہر قدم رکھنا ممکن نہیں

اِنسان کسی مذہب یا مِلّت میں چلا جائے وہ اپنی فطرت سے بھاگ نہیں سکتا اور مجبور ہوتا ہے کہ ہر حالت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کو پُورا کرے۔ اگر وہ خدا کی صفات کے حسن و کمال سے آشنا نہ ہو سکے اور لہٰذا خدا سے محبت نہ کر سکے تو اس کا جذبۂ محبّت کسی غلط نصب العین کے ذریعہ سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا نصب العین خواہ کچھ ہو، وہ کوئی بے جان چیز مثلاً ایک پتھر یا درخت یا دریا یا پہاڑ ہو یا کوئی بُت یا قوم یا ملک یا نسل ہو یا کوئی زندہ حیوان مثلاً گائے یا بندر یا سانپ ہو یا کوئی ایسا تصوّر ہو جو کسی نظریہ یا ازم کا مرکز ہو۔ انسان ہر حالت میں خدا کی محولہ بالا صفات کو اپنے نصب العین کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر منسوب کرتا ہے۔ مثلاً اگر اس کا نصب العین کسی ایسی چیز کا تصوّر ہو جو مردہ اور بے جان ہے تو پھر بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک زندہ شخصیت ہے جس کے اندر محبت اور نفرت اور قدرت اور قوت اور حسن اور نیکی اور صداقت کے اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس کے لیے ممکن ہوتا ہے کہ اپنے تمام اعمال کو اس کے تابع کرے اور دل ہی دل میں اُس سے دعائیں مانگے اور برکتیں چاہے۔

مرا از خود بروں رفتن محال است بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اسرارِ حیات کی کلید

چونکہ انسان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ خدا کی آرزُو یا محبّت ہے، اقبال

بجا طور پر سمجھتا ہے "زندگی کے سربستہ رموز کی کلید انسان کا اپنا دل ہے اور زندگی کے مقصد کو سمجھنے کے لیے اسے اپنے دل ہی کی آرزو کو سمجھنا چاہیے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

اپنی اسی آرزو یا محبت کی وجہ سے انسان خدا کے ذکر سے دل جمعی اور اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے۔

دلِ ما آتش و تن موجِ دُو دش
تپیدن دم بدم سازِ وجودش
بذکرِ نیم شب جمعیت اُو
چو سیمابے کہ بندو چوب عودش

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے دل خدا کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، خبردار دلوں کو اطمینان خدا کے ذکر سے ہی حاصل ہوتا ہے)

قرآن حکیم میں ہے کہ ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (اور بے شک ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے) انسان کی اس عزت اور عظمت کا باعث یہی ہے کہ خدا نے اس کے دل میں اپنی محبت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔

انسان کی سب سے بڑی ضرورت

انسان کی سب سے بڑی ضرورت خدا ہے اور اس کی باقی تمام ضرورتیں اس سب سے بڑی ضرورت کے ماتحت اس کی خدمت گزار ہیں۔ انسان کی اس ضرورت کا پورا کرنا، اس کو خدا کی معرفت بہم پہنچانا اور اس کو یہ بتانا کہ کون سا عمل خدا کی محبّت کی نشو و نما کرنے والا ہے اور کون سا اس کے منافی ہے، انسان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو کا مقصود انسان کی اس ضرورت کی تکمیل ہونا چاہیے۔ ہم انسانیت کے لیے اور جو کچھ بھی کریں وہ اس ضرورت کی

تکمیل کی کوشش کے بالمقابل ہیچ ہے۔ کیونکہ انسان کی اسی ضرورت کا نام انسان یا آدم ہے ؎

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ

انسان کی انسانیت کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ اسے خدا کی محبت کا جذبہ عطا کیا گیا ہے چونکہ انسان کی اصل خدا کی محبت کا جذبہ ہے۔ خدا کا منکر ہونے سے جو بڑی خرابی پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ اس سے انسان کو اپنا منکر ہونا لازم آتا ہے۔ اگر انسان اپنے آپ پر ایمان لے آئے تو یہ کافی ہے کیونکہ پھر اس ایمان میں خدا پر ایمان لانا خود بخود شامل ہو جاتا ہے۔ انسان کو خود اپنی ذات کی تکمیل اور شخصیت کی نشوونما کے لیے خدا کے تصور کی ضرورت ہے۔ جو شخص خدا کی عبادت اور اطاعت کرتا ہے وہ درحقیقت اپنی تکمیل کا خواہشمند ہے۔ لہٰذا یہ آخر کار خدا پرستی نہیں بلکہ خود پرستی ہے۔ ہم خودی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے۔ ہماری خودی ہی سب کچھ ہے' اسی کو جاننا، پہچاننا اور اس کی تربیت اور تکمیل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ یہ مقصد خدا کی مخلصانہ عبادت اور اطاعت کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔

مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

خدا کی محبّت کے لیے اقبال کی اصطلاحات

انسان سراسر آرزوئے جمال ہے اور یہ آرزوئے جمال کمزور بھی نہیں بلکہ نہایت طاقتور ہے۔ انسان کیا ہے تمنائے حسن کا ایک زبردست طوفان ہے جو موجزن ہے' اگر یہ طوفان تمنّا نہ رہے تو انسان بھی باقی نہیں رہتا۔

نہ ہو طغیانِ مشتاقی تو میں رہتا نہیں باقی
کہ میری زندگی کیا ہے یہی طغیانِ مشتاقی

اسی آرزوئے جمال یا خدا کی محبّت کو اقبال نے اپنے کلام میں کبھی آرزو، کبھی تمنا، کبھی دل، کبھی نظر، کبھی نگاہ، کبھی درد، کبھی داغ، کبھی سرور، کبھی سوز، کبھی بادہ، کبھی نشہ، کبھی مشتاقی، کبھی مستی،

کبھی شوق، کبھی خونِ دل، کبھی خونِ جگر، کبھی آہ سحر گاہی، کبھی جان، کبھی غم، کبھی تب و تاب، کبھی جذبِ اندروں، کبھی جذبِ مسلمانی، کبھی جذبِ قلندرانہ، کبھی فقر، کبھی درویشی، کبھی ذوقِ تجلّی، کبھی عشق اور کبھی محبّت کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ اور چونکہ یہ آرزوئے جمالِ یا خدا کی محبت مخالفانہ آرزوؤں سے آزاد ہونے کے بعد نہایت ہی زوردار عمل میں ظاہر ہوتی ہے جس کا لازمی نتیجہ تسخیرِ کائنات ہوتا ہے، لہٰذا اقبال اسے کبھی ذوقِ تسخیر کا نام بھی دیتا ہے۔

چیست جاں جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

خدا کی محبّت کے بغیر انسان مُردہ ہے

جب انسان کی اصل فقط خدا کی محبت ہے اور اس کے علاوہ انسان اور کچھ بھی نہیں یا زیادہ سے زیادہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ یا گوشت کا ایک ڈھیر ہے تو پھر یوں کہنا چاہیے کہ جو شخص ہمہ تن خدا کی محبت نہیں وہ بحیثیت ایک انسان کے موجود ہی نہیں۔ کیونکہ جس حد تک ایک انسان اپنی زندگی کے تقاضوں کی تشفی اور تکمیل کرتا ہے اسی حد تک وہ زندہ اور موجود سمجھا جا سکتا ہے۔ زندگی یا خودی اس وقت آشکار ہوتی ہے جب خدا کی محبت آشکار ہوتی ہے اور اپنی تکمیل اور تشفی کے مدارج سے گزرتی ہے۔ یہی خودی کی نمود یا زندگی کی نمود ہے۔ خدا کی محبت کی تربیت خودی کی نمود ہے اور خودی کی نمود کا ہی دوسرا نام زندگی یا وجود ہے۔ زندگی فقط خدا کی محبت کی آشکارائی ہے۔ اگر خدا کی محبت نہیں تو زندگی بھی نہیں۔

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود
مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

جو شخص اس بات کا قائل نہیں کہ اس کے اندر خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ موجود ہے جس کی تسکین اور تشفی اُسے خدا کا مقرب بنا سکتی ہے وہ شخص اپنے آپ کو ایک انسان کی حیثیت

سے نہالِ سدرہ کی مقدس شاخ یا دُوسرے لفظوں میں بالقوہ خُدا کا مقرب نہیں سمجھتا بلکہ چمن کائنات کا کوڑا کرکٹ سمجھتا ہے وہ خدا کا ہی منکر نہیں بلکہ اپنا بھی منکر ہے۔ لیکن اگر انسان خدا سے الگ ہوکر خدا کا منکر بنتا ہے تو اپنے آپ سے الگ ہوکر اپنا منکر تو نہ بنے، اگر وہ اپنا منکر نہیں تو پھر اُسے خدا کے اقرار سے گریز کیسے ہوسکتا ہے۔ ؎

شاخِ نہالِ سدرۂ خار و خسِ چمن مشو
منکرِ اُو اگر شدی منکرِ خویشتن مشو

خدا کا انکار اپنا انکار ہے

خدا کے اقرار کا مقصد یہ ہے کہ خدا سے ایسی محبّت کی جائے جس سے انسان کی اپنی شخصیّت کی ترقی اور تکمیل ہو۔ جو شخص خدا کا اقرار کرتا ہے لیکن خدا سے محبّت نہیں کرتا وہ خدا کے اقرار سے اپنی شخصیّت کی تربیت کا فائدہ حاصل نہیں کرتا۔ وہ خدا کا منکر تو نہیں لیکن اپنا منکر ہے۔ جب وہ خدا کے اقرار کے مقصود سے بے خبر ہے تو اس کا اقرار انکار سے بہتر نہیں بلکہ بدتر ہے کہ یہ خدا کو جاننے کے بعد خدا کی ناقدری ہے۔

منکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر است

خدا پر ایمان لانے اور خدا سے محبت کرنے کا فائدہ خود انسان کو ہے کہ اس کے بغیر انسان کا اپنا وجود متحقّق نہیں ہوسکتا۔ خودی کی زندگی یہ ہے کہ وہ بڑھے اور پھُولے اور تربیت اور ترقی پاکر اپنے مخفی کمالات کو آشکار کرے۔ نشوونما زندگی کا خاصہ ہے۔ زندگی اگر نشوونما نہ پائے تو زندگی نہیں، بیج اگر نشوونما پا رہا ہے تو زندہ ہے۔ اگر نشوونما پانے سے رہ گیا ہے تو مُردہ ہے۔ اگر ایک جسم حیوانی نشوونما پا رہا ہے تو زندہ ہے ورنہ مردہ ہے یا جان بلب۔ نمود اور آشکارائی وجود یا زندگی سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔

گفت موجود آنکہ مے خواہد نمود
آشکارائی تقاضائے وجود

خُودی کی زندگی اور ترقی کے لیے خدا کی محبّت کی ضرورت

لیکن خُودی کی تربیت اور ترقی اور نشوونما اور بالیدگی کا مقصد خدا کی محبت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ خودی فقط خدا ہی کی سمت میں کامل نشوونما پاسکتی ہے۔ لہٰذا خدا کے منکر کو چاہیئے کہ اپنی زندگی کی فکر کرے یعنی خدا پر ایمان لائے اور خدا کی محبّت کا حق ادا کر کے زندگی پائے۔

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا

جو شخص خدا کے بغیر جی رہا ہے وہ مردار ہے۔ اگرچہ لوگ اس کا ماتم نہیں کرتے۔

آنکہ بے حق زیست جز مردار نیست
گرچہ کس در ماتمِ او زار نیست

خدا کی محبّت سے دِل کی کلی شگفتہ ہوتی ہے

جس طرح سے پھُول کی کلی نسیمِ سحر کے بغیر کھِل نہیں سکتی۔ انسان کے دل (یعنی خودی) کی کلی خدا کی محبّت کے بغیر کھِل نہیں سکتی۔ جس طرح سے صبح کی ہوا کے زندگی بخشنے والے اثر سے پھُول کی کلی شگفتہ ہوجاتی ہے اسی طرح سے خدا کی محبت کے زندگی اور راحت بخشنے والے اثر سے انسان کا دل مسرّت سے بھر جاتا ہے۔ مومن کے دل کی ساری داستان کا حاصل اور اس کی زندگی کی ساری تگ و دُو کا باعث یہ ہے کہ جس طرح کلی نسیم سحر کے لیے تشنہ ہوتی ہے، مومن کا دِل خدا کی محبّت کے لیے تشنہ ہوتا ہے۔

کلی کو دیکھ کہ ہے تشنۂ نسیمِ سحر
اسی میں ہے مرے دل کا تمام افسانہ

انسان کا خدا سے بھاگنا اپنی تربیت اور تکمیل کو روک دینا ہے۔ حالانکہ خدا وہ ذات پاک ہے جو انسان کو پیدا کرتی ہے اور پھر اسے جسمانی نشوونما کے کمال پر پہنچاتی ہے۔ یہی ذاتِ پاک اس کی روحانی اور نفسیاتی نشوونما کی ضامن بھی ہے۔ خدا کی محبّت سے ہی انسان کی خودی لالہ کے پھُول کی

طرح اپنے حسن کے کمال کو پہنچتی ہے لہٰذا خدا سے حجاب کی وجہ کیا ہے۔ اگر لالہ کی کلی جو کھل کر پھول بن جاتی ہے اور ایک دلہن کی طرح رنگین لباس میں ملبوس ہو جاتی ہے، نسیم سحر سے دلہنوں ہی کی طرح حجاب کرے تو وہ اپنے حسن کے کمال کو کیسے پہنچ سکتی ہے۔

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں

خدا کی محبّت خودی کے ارتقاء کی شرط ہے

انسان کا خدا سے گریز کرنا اپنے آپ سے گریز کرنا ہے کیونکہ خدا کی محبت کے بغیر انسان اپنے آپ کو نہیں پا سکتا اور اگر انسان خدا سے بھاگے گا تو زُود یا بدیر پھر اس کو خدا ہی کی طرف واپس لوٹنا پڑے گا۔

از کہ بگریزیم از خود ایں محال
از کہ رو تابیم از خود ایں خیال

مومن اسی حقیقت کا اعتراف کرتا ہے جب وہ کہتا ہے لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَامَنْجَاً مِنَ اللّٰہِ اِلَّا اِلَیْہِ (کفر اور ہر بُری چیز سے بچنا اور ایمان اور ہر اچھی چیز پر قدرت پانا خدا کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور خدا سے بھاگنے کے بعد اگر کوئی راستہ نجات کا ہے تو خدا ہی کی طرف ہے) جس طرح سے خدا نے انسان کی جسمانی نشو ونما اپنے ذمّہ لے رکھی ہے اسی طرح سے اس نے انسان کی روحانی یا نفسیاتی نشو ونما بھی اپنے ذمّہ لے رکھی ہے۔ لیکن چونکہ انسان اپنے فکر و عمل میں آزاد ہے وہ اپنی نشو ونما کی روحانی یا نفسیاتی سطح پر اپنے اختیارات کو غلط طور پر کام میں لاتا ہے اور اس طرح سے خدا کے مقاصد میں حائل ہوتا ہے۔ اے انسان! کون سی چیز ہے جو تمہیں ایسے رحیم وکریم خدا سے جو تمہارا رب ہے بغاوت پر مجبور کرتی ہے (یَاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ) انسان کا روحانی یا نفسیاتی ارتقا جو دراصل اس کی خودی کا ارتقا ہے، اُس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے اختیارات کو بتمام وکمال خدا کے تابع نہ کر دے اور اپنے آپ کو کلیۃً خدا کے سپُرد نہ کر دے۔ اقبال اس خیال کو یوں ظاہر کرتا ہے:-

خویش را در بازو خود را باز گیر
دام گستر از نیاز و ناز گیر

(اپنے آپ کو ہار دے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اپنی خودی کو پالے اطاعت اور فرمانبرداری کا دام پھیلا اور خودداری کو اپنی گرفت میں لا!)

یک بینی اور یک اندیشی کے بغیر خودی اپنے آپ کو نہیں پا سکتی

چونکہ خدا کی محبت خودی کی مرکزی خواہش ہے اور باقی خواہشات اس کے تابع ہیں پس جو خواہش اس خواہش کی حریف ہوتی ہے وہ خودی کی اپنی خواہش نہیں ہوتی بلکہ خودی کی خواہش کے راستہ میں ایک ناگوار بلکہ خطرناک رکاوٹ ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر ایسی خواہش کو مٹانا خودی کے لیے ضروری ہوتا ہے تاکہ خودی اپنے آپ کو پا سکے اور اپنی فطرت کے مخفی کمالات کو آشکار کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں ماسوی اللہ سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہونا خودی کی فطرت ہے۔ جب تک خودی غیر اللہ کے ساتھ وابستہ رہے وہ اپنے آپ کی طرف آنے کے لیے یعنی اپنی فطری محبت کی تشفی اور تکمیل کے لیے آزاد نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب وہ غیر اللہ سے کٹ جائے تو اپنے آپ کی طرف لوٹنے کے لیے آزاد ہو جاتی ہے اور غیر اللہ کو اپنے نصب العین کے تابع کر دیتی ہے۔ جب تک انسان خدا کی محبت میں پختہ نہ ہو یا ماسوی اللہ سے پوری طرح نہیں کٹ سکتا۔

تا نہ رمزِ لا الہ آری بدست
بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

اگر ہم غیر اللہ کی محبت سے کنارہ کش ہو کر خودی کے جذبۂ محبت کو آزادی کے ساتھ اپنا اظہار کرنے دیں تو خدا ملتا ہے اور اگر ہم آزادی کے ساتھ خدا کی جستجو کریں تو ہماری خودی اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔ گویا ہمیں اپنی خودی سے خدا ملتا ہے اور خدا سے اپنی خودی ملتی ہے اور دونوں انعامات کی حقیقت ایک ہی ہے۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

اس شعر کا پہلا مصرع گویا قرآنِ حکیم کی اس آیت کا ترجمہ ہے وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا (ہر ایک سے کٹ کر خدا سے وابستہ ہو جائیے)

خدا کی نمود خودی کی نمود ہے

انسانی خودی کی زندگی یا اس کے وجود کی علامت یہ ہے کہ وہ برابر نشوونما کرتی رہے اور اس کے مخفی کمالات کی نمود یا آشکارائی ہوتی رہے۔ لیکن یہ بات خدا کی محبت کے بغیر ممکن نہیں ہوتی اور جب انسانی خودی کی نمود ہوتی ہے یعنی اس کے مخفی علمی، اخلاقی، روحانی اور جمالیاتی کمالات آشکار ہوتے ہیں تو اس دنیا میں خدا کی صفات کے کمالات و محاسن کی آشکارائی یا نمود بھی ساتھ ہی عمل میں آتی ہے۔ خدا کی نمود خودی کی نمود کی صورت اختیار کرتی ہے۔

خودی را از وجودِ حق وجودے
خودی را از نمودِ حق نمودے

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجیے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجیے

ھدیہ فی نسخہ: تین روپے۔ تبلیغی مقصد کے لیے یک صد نسخوں پر ۳۳ فی صد کمیشن دیا جائے گا:

توضیح وتنقیح

مولانا عبدالباسط

"لولاك لما خلقت الافلاك" کے بارے میں وضاحت

۱ - امام اسماعیل بن محمد العجلونی الجراحي (المتوفی ۱۱۷۵ء) نے اپنی کتاب "کشف الخفاء ومزیل الالباس" میں امام الصغانی کا یہ قول لکھا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے۔

(جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ طبقہ مکتبۃ التراث الاسلامی، حلب، سوریا)

۲ - امام الصغانی (المتوفی ۶۵۰ھ) نے اپنی کتاب "الموضاعات" میں صفحہ ۷ پر لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

(موضوعات الصغانی مطبوعۃ دار نافع للطباعۃ والنشر القاہرہ الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء)

۳ - محدث محمد ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب "سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ" جلد اوّل میں صفحہ ۲۹۹ پر اسے موضوع کہا ہے، محدّث البانی نے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کو بھی ردّ کیا ہے کہ اس کا مفہوم صحیح ہے، محدّث البانی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا مفہوم بھی صحیح نہیں ہے۔

(سلسلہ ــــ الخ جلد اوّل مطبعۃ المکتب الاسلامی، بیروت الطبعۃ الرابعۃ ۱۳۹۸ھ)

۴ - امام السیوطی المتوفی سنہ ۹۱۱ھ نے اپنی کتاب "اللالیٔ المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ" میں بھی اس حدیث کو ("لولاك لما خلقت الدنیا") موضوع کہا ہے

(جلد اول کتاب المناقب صفحہ ۲۷۲ دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر بیروت الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۰۱ھ - ۱۹۸۱ء)

۵ - امام جوزی المتوفی ۵۹۷ھ نے اپنی کتاب الموضوعات ج ۱ میں لکھا ہے کہ "لولاك (یا محمد) ما خلقت الدنیا" یہ حدیث موضوع ہے۔

(صفحہ ۲۸۹ جلد اوّل (فصل) حدیث آخر فی فضلہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الانبیاء المکتبۃ السلفیہ

مدینہ منورہ الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۶ھ - ۱۹۷۷ء)

میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان پانچ حوالوں کے بعد اب مزید کسی اور حوالے کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ حوالے اس بات کی پختگی کے لئے دلیل ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے۔

میثاق اور حکمتِ قرآن، دونوں میں (یا کہیں اور بھی) جب کبھی بھی کوئی حدیث لکھی جائے، یا اسے بیان کیا جائے تو اس بات کا لحاظ رکھا جائے کہ یہ حدیث صحت کے لحاظ سے کیا ہے؟ اگر حدیث موضوع ہو تو اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ یہ حدیث موضوع ہے وگرنہ (اللہ نہ کرے) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولنا ہوگا اور اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

"من کذب علي متعمدًا فليتبوأ مقعده من النار"

جو شخص جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھے وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنائیگا۔

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں ——

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

تبصرۂ کتب

مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت

تالیف : مولانا اخلاق حسین قاسمی

قیمت : ۴۸ روپے • ملنے کا پتہ : سنی پبلیکیشنز، عزیز مارکیٹ اردو بازار - لاہور

مولانا ابوالکلام آزاد رواں صدی کے ان عظیم رجالِ کار میں سے تھے جو مدتوں بعد دنیا میں آتے اور ایک دور کو متاثر کر جاتے ہیں۔ غلام ہندوستان کا یہ عظیم عبقری اور نابغہ ملتِ مسلمہ کی عظمتِ رفتہ کی بحالی اور آزادیٔ وطن کی جنگ میں قائدانہ رول ادا کرنے کے بعد ۱۹۵۸ میں جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایک عہد اسے رویا اور اس کی موت کے بعد مختلف حوالوں سے دنیا نے اُسے یاد کیا، کر رہی ہے اور کرتی رہے گی ـــــ موجودہ سال آزاد صدی کے سال کے طور پر پڑوسی ملک میں منایا جا رہا ہے۔ اور ساتھ ہی پاکستان میں مولانا کے حوالے سے شدید تعصب کے باوصف اُن کے لاتعداد عقیدت مند اپنی عقیدت کا اظہار کر رہے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے سیاسی نظریات سے تو بلاشبہ اختلاف ممکن ہے لیکن ان کی خدمتِ قرآنی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ـــــ زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی کڑی ہے جسے آج کی دلی کے سب سے بڑے مفسرِ قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے ترتیب دیا ہے اور اس کی اشاعت کا شرف "سنی پبلیکیشنز" کے اربابِ حل و عقد کو حاصل ہوا ہے۔

مولانا آزاد کی زندگی کی مختلف جہات میں ایک جہت ان کی خدمتِ قرآن ہے جو ترجمان القرآن کے نام سے سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں ایک نامکمل شاہکار ہے۔ آزادیٔ وطن کی صبر آزما جدوجہد میں مولانا کے مسوداتِ ترجمہ و تفسیر ایک سے زائد مرتبہ اس وقت کی اندھی بہری انتظامیہ کے ہتھے چڑھ کر ضائع ہوئے۔ اس کے باوجود ۱۸ پارے محفوظ رہ گئے جو چالیس برس سے برابر پاکستان ہندوستان میں شائع ہو رہے ہیں اور ان کا انگریزی ترجمہ بھی ہو چکا ہے ـــــ اس ترجمہ و تفسیر کو اگر عربی مبین کی اردوئے مبین میں تشریح و ترجمانی قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا ـــــ امر واقعہ یہ ہے

کہ قرآنی علوم و معارف کا یہ وہ عظیم خزانہ ہے جسے متحدہ ہندوستان کے سب سے بڑے عالم شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر ابوالکلام نے مرتب کیا اور مفسرین کی لاطائل بحثوں سے ہٹ کر نفس قرآن کو سمجھانے کی تدبیر کی ـــــ مولانا قاسمی جو خود قرآن کے عظیم خادم ہیں، انہوں نے قرآنی علوم و معارف کے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہو کر اس بصیرت افروز کتاب کو مرتب کیا ہے جس کا "تقدمہ" امارت شرعیہ بہار کے امیر اور ہندوستان کے بیدار مغز عالم مولانا سید منت اللہ نے لکھا تو "حرفے چند" کے عنوان سے مولانا سعید الرحمٰن علوی نے کتاب اور مرتب کا بھرپور تعارف کرایا۔ اس کتاب کو پیش کرنے کا اعزاز سنی پبلیکیشنز کو حاصل ہوا۔ معیاری حسن کے ساتھ طبع شدہ یہ کتاب ہمارے دینی لٹریچر کا بیش بہا خزانہ ہے جس کی بھرپور پذیرائی از بس لازم ہے ـــــ امید کہ اربابِ ذوق و دانش اس کتاب کا شایانِ شان خیر مقدم کریں گے۔

تحریک مسجد شہید گنج

مرتب: جناب جانباز مرزا

قیمت: ۵۰/- روپے، ملنے کا پتہ: سنی پبلیکیشنز عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور

جناب جانباز مرزا ستر سال سے زائد عمر میں جوانوں سے بڑھ کر با ہمت ہیں، امرتسر کے غریب گھرانے کا یہ انسان ابتدائی عمر ہی میں فرنگی استبداد سے ٹکرانے کی ڈگر پر چل پڑا اور ضروری تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا لیکن اس نے مجلس احرارِ اسلام میں وقت کے عظیم رہنماؤں سے وابستہ ہو کر جلتی پھرتی درس گاہوں سے وہ کچھ حاصل کیا جو بڑے سے بڑے دانشوروں کو حاصل نہ ہو سکا۔ جانباز مرزا نے ہمت مردانہ سے کام لے کر اس صدی کے سب سے بڑے خطیب سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی مبسوط اور مدلل سوانح مرتب کی تو قافلۂ احرار اور اس صدی کی باقی ملک گیر جماعتوں کانگریس جمعیۃ علماء ہند اور مسلم لیگ کی خدمات و کردار کے پس منظر میں ۸ مبسوط جلدیں "کاروانِ احرار" کے عنوان سے لکھیں جنہیں ملک بھر کے اخبارات اور اہلِ دانش نے سراہا ـــــ اب انہوں نے لڈے بازار کی مسجد شہید گنج جو نصف صدی زائد سے آوازِ اذان سے محروم ہے، کی مبسوط تاریخ پر قلم اٹھایا ہے۔ اور فرنگی اور اس کے نام نہاد مسلم گماشتوں کے چہروں سے اس طرح نقاب سرکایا

(باقی صفحہ پر)

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

قربِ الٰہی کے دو مراتب

کتاب و سنّت کی روشنی میں

اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے

سفید کاغذ، عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۹۶، ہدیہ -/۱۰ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآراء تصنیف

مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

عمدہ سفید کاغذ دیدہ زیب طباعت خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

AUGUST 1988 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 7
NO. 8

اعلان داخلہ

قرآن کالج — لاہور

الحمدللہ کہ گذشتہ سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا باضابطہ آغاز ہو چکا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ایف۔ اے/ ایف۔ ایس۔ سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اور تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تکمیل بھی کرا دی جاتی ہے۔ جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں:

★ ایف اے/ ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔

★ داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۹ ستمبر ۸۸ء ہے جبکہ داخلہ ٹیسٹ یا انٹرویو ان شاء اللہ اکتوبر کے مہینے میں ہوگا۔ جس کی معینہ تاریخ سے درخواست دہندگان کو مطلع کر دیا جائے گا۔

★ ذہین اور مستحق طلبا کے لیے اخراجات میں رعایت کی گنجائش بھی ممکن ہے۔

★ بیرون لاہور کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ: کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام پانچ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر روانہ کریں۔

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
فون: ۵۲۶۸۳